www.ghamidi.net

مقامات

www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

مقامات

www.ghamidi.net

المورد
ادارۂ علم و تحقیق

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

www.ghamidi.net

ناشر: المورد

طابع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

طبع دوم: جنوری 2010ء

قیمت: 190 روپے

ISBN: 978-969-8799-35-9

Al-Mawrid: 51-K, Model Town, Lahore, Pakistan. Ph: +92 42 3586 5145, 3583 4306
3rd Floor Snowhite Center Main Abdullah Haroon Road Sadar Karachi +92 21 35681597
www.al-mawrid.org www.tv-almawrid.org info@al-mawrid.org almawrid@brain.net.pk

فہرست

ذوق و شوق

۱	میرا نام	۱۳
۲	روداد سفر	۱۸
۳	قافلہ در قافلہ	۲۹
۴	میرے بعد	۴۵
۵	رفیق صبوحی	۴۸
۶	می باقی	۵۱
۷	دبستان شبلی	۵۴
۸	شعلہ و نشیمن	۶۳
۹	چراغ آرزو	۶۴
۱۰	معجزۂ فن	۶۶
۱۱	تہذیب کی جنگ	۶۹

www.ghamidi.net

۱۲ قارعشق ۷۳
۱۳ بہ آشیاں نہ نشینم ۷۷
۱۴ انسانم آرزوست ۸۰
۱۵ قافلۂ بے خوداں ۸۲
۱۶ حریف صرصر و باراں ۸۶
۱۷ ہم نفس ۸۹
۱۸ دیدۂ صورت پرست ۹۲
۱۹ ہستی کا اعتبار ۹۵
۲۰ نیا فتنہ ۹۷
۲۱ امین احسن ۹۹

دین و دانش

۱ ایمان بالغیب ۱۳۵
۲ اسلامی تہذیب ۱۳۶
۳ حلال و حرام ۱۳۸
۴ حدیث و سنت ۱۴۲
۵ جہاد و قتال ۱۴۵
۶ نہی عن المنکر ۱۴۸

www.ghamidi.net

۷ رویت ہلال کا مسئلہ ۱۵۱
۸ ڈاڑھی اور اسبال ازار ۱۵۴
۹ وصیت کا حق ۱۵۶
۱۰ سود کا مسئلہ ۱۵۸
۱۱ عورت کی تادیب ۱۶۱
۱۲ طلاق کا حق ۱۶۳
۱۳ سر کی اوڑھنی ۱۶۵
۱۴ نیل پالش ۱۶۷
۱۵ عورتوں کا سفر ۱۶۸
۱۶ اسقاط حمل ۱۷۰
۱۷ حفظ فروج ۱۷۳
۱۸ اعضا کی پیوند کاری ۱۷۵
۱۹ ضبط ولادت ۱۷۸
۲۰ مباشرت کے حدود ۱۸۱
۲۱ بیمہ ۱۸۴
۲۲ محمد اور احمد ۱۸۷
۲۳ زبان کا ایک اسلوب ۱۸۸

www.ghamidi.net

نقد و نظر

۱	علم و تحقیق کا المیہ	۱۹۷
۲	دین اور عقل	۲۰۱
۳	قرآن کا موضوع	۲۰۳
۴	نفاذ شریعت	۲۰۷
۵	دینی ولادینی	۲۱۲
۶	مسئلۂ قومیت	۲۱۵
۷	ہماری تعلیم	۲۱۷
۸	تعلیمی نظام	۲۲۹
۹	ہماری مسجدیں	۲۳۲

www.ghamidi.net

دیباچہ

یہ متفرق تحریروں کا مجموعہ ہے۔ میں نے اِسے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے: پہلا حصہ میرے جذبات و احساسات اور حالات و وقائع کا مرقع ہے۔ دوسرے میں بعض توضیحات اور دین کے اجتہادی مسائل سے متعلق میری آرا بیان ہوئی ہیں۔ تیسرا حصہ تنقیدی مضامین کے لیے خاص ہے۔ علم و فکر اور قلم و قرطاس کی دنیا میں کم و بیش ربع صدی کا سفر ہے جس کے کچھ اہم منازل اِس کتاب میں نمایاں ہو گئے ہیں۔ اِس کے لیے ''مقامات'' کا نام اِسی لحاظ سے تجویز کیا گیا ہے:

کارواں رفتہ و اندازۂ جاہش پیداست
زیں نشاں ہا کہ بہ ہر راہ گذار افتادست

المورد، لاہور
اکتوبر ۲۰۰۸ء

—— جاوید

www.ghamidi.net

ذوق وشوق

میرے پاس ادیب کا قلم ہے، نہ عالم کا دماغ۔ میری حیثیت بس ایک طالب علم کی ہے۔ میں اِس سفر کی ابتدا اللہ کے بھروسے پر کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اگلوں نے یہ راستہ بڑی شان کے ساتھ طے کیا ہے۔ اُن کے نقوش قدم میرے سامنے ہیں۔ میں مقامات و منازل کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنے نفس کی کمزوریوں کا احساس ہے۔ میں اِس راہ کو اختیار نہ کرتا، لیکن میں جانتا ہوں کہ اِس کے سوا ہر راہ خسارے کی راہ ہے اور مجھے معلوم ہے کہ اللہ اِس راہ پر چلنے والوں کی مدد کرتا ہے۔ میں نے قلم اِسی اعتماد پر اٹھایا ہے، اور مجھے یقین ہے کہ خیال و خامہ کو ایک دن اُس کے حضور میں جواب دہ ہونا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے حق کہنے اور حق کا ساتھ دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ علیہ توکلت و الیہ انیب۔

[۱۹۷۹ء]

www.ghamidi.net

میرا نام

میرے نام کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ والدہ کو ''جاوید'' پسند تھا۔ پیدایش کے بعد والد اپنے شیخ سے دعا کرانے کے لیے لے کر گئے تو اُنھوں نے فرمایا: اِس کا نام ہم درویشوں کے طریقے پر ہونا چاہیے۔ اِسے ''کاکوشاہ'' کہا کرو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بادشاہ اِس کے پاس نیاز مندانہ حاضر ہوں گے۔ میری چھوٹی خالہ برسوں والدہ کے پاس رہی تھیں۔ والد اور والدہ، دونوں اُن سے بہت محبت کرتے تھے۔ اُن کے ایک بیٹے مجھ سے تین سال بڑے تھے جن کا نام اُنھوں نے ''رفیق'' رکھا تھا۔ اِس کی مناسبت سے اُنھیں اصرار تھا کہ میرا نام ''شفیق'' رکھا جائے۔ وہ اِس کے سوا کوئی دوسرا نام قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھیں۔ اِس کے کچھ دنوں بعد بڑی خالہ دیکھنے کے لیے آئیں تو اُنھوں نے فرمایا: میں نے تو پہلے سے اِس کا نام ''کاکا محمد'' رکھا ہوا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ میرے گھر والوں نے اِس کا آسان حل یہ تلاش کیا کہ تمام نام قبول کر لیے۔ چنانچہ یہ بزرگ جب تک زندہ رہے، مجھے اپنی پسند کے ناموں سے پکارتے رہے۔

مدرسہ میں داخلے کا وقت آیا تو والد موجود نہ تھے۔ اُس زمانے میں بعض اوقات وہ مہینوں کے لیے اپنے شیخ کی خانقاہ کوٹلی مغلاں چلے جاتے تھے۔ اُن کے ایک عزیز دوست تھے جنھیں ہم چچا کہتے تھے۔ والد کی عدم موجودگی میں وہ مجھے داخل کرانے گئے۔ میرے لیے اُسی اسکول کا انتخاب کیا گیا جس میں میرے خالہ زاد بھائی رفیق پڑھتے تھے۔ نام لکھاتے وقت چچا نے مجھ سے پوچھا تو میں نے سارے نام بتا دیے۔ وہ سخت پریشان ہوئے کہ اب فیصلہ کس طرح کیا جائے۔ اُنھوں نے رفیق کی طرف دیکھا تو اُس نے کہا: ہمارے گھر میں تو اِسے ''شفیق'' ہی کہتے ہیں۔ چچا نے چند لمحوں کے لیے توقف کیا اور پھر یہی نام اسکول کے رجسٹر میں درج کرا دیا۔

میں جب شعور کی عمر کو پہنچا تو مجھے والدہ کا رکھا ہوا نام زیادہ پسند آیا، لیکن اب اسکول کے رجسٹر کا کیا کیا جائے؟ اپنے ایک استاد محمد صادق صاحب سے بات کی تو اُنھوں نے فرمایا: اِس مرحلے پر نام تبدیل کرنا تو مشکل ہوگا۔ تمھیں شعر کہنے کا شوق ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ جاوید تخلص کر لو۔ میں تمھارا نام ''شفیق احمد جاوید'' لکھ دیتا ہوں۔ تمھیں ''شفیق'' پسند نہیں تو اپنا قلمی نام ''جاوید احمد'' بھی رکھ سکتے ہو۔ مجھے یہ تجویز پسند آئی۔ دوست احباب پہلے ہی ''جاوید'' کے نام سے پکارتے تھے۔ چنانچہ کالج کے زمانے سے اِسی نام کی شہرت ہوگئی۔ بعد میں شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ بنانے کا موقع آیا تو سب جگہ یہی نام لکھا گیا۔

میں غالباً نویں جماعت میں تھا کہ اپنے ایک پھوپھی زاد بھائی کی شادی میں

شرکت کے لیے لاہور آیا۔ یہاں مجھے پہلی مرتبہ دس پندرہ دن تک بڑے چچا محمد لطیف خان صاحب کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ اُنھیں اپنے والد اور میرے دادا نور الٰہی صاحب سے عشق کی حد تک محبت تھی۔ رات دن وہ مجھے اُن کے قصے سناتے اور بتاتے تھے کہ گاؤں میں تمھارے دادا ایک مصلح کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ اُن کی نیکی، خدا ترسی اور دانائی کی وجہ سے لوگ اپنے جھگڑے چکانے کے لیے اُن کی طرف رجوع کرتے اور اُن کا ہر فیصلہ مان لیتے تھے۔ اُن کی باتوں نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ یہ تاثر اتنا شدید تھا کہ میں ہر وقت دادا کے بارے میں سوچتا، یہاں تک کہ کئی دن تک سوتا تو خواب میں بھی اُنھی کو دیکھتا تھا۔

اِس موقع پر خاندان کے ایک دوسرے بزرگ اور بچوں کے لیے دینی کتابوں کے مصنف مقبول انور صاحب داؤدی سے ملاقات ہوئی۔ اُن کی یہ نسبت ہمارے گاؤں ''داؤد'' کی وجہ سے تھی۔ میرے والد کا پورا نام بھی اگرچہ محمد طفیل جنیدی تھا، لیکن بعض اوقات کوئی چیز اچانک متوجہ کر لیتی ہے۔ داؤدی صاحب سے ملنے کے بعد پہلی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ میرے نام کے ساتھ بھی اِس طرح کا کوئی اضافہ ہونا چاہیے۔ لڑکپن میں ایسی خواہشیں بعض اوقات آدمی کے ذہن پر سوار ہو جاتی ہیں۔ میں بھی دن رات یہی سوچتا۔ ایک دن والد صاحب سے اِس موضوع پر بات ہوئی تو اُنھوں نے مقبول صاحب کی اتباع میں ''داؤدی'' کا اضافہ کر لینے کی تجویز دی۔ پھر فرمایا: ہمارے شیخ سے بیعت کر لیتے تو ''جنیدی'' بھی ہو سکتے تھے۔ اِدھر میری

خواہش تھی کہ یہ نسبت دادا سے ہو۔ چچا سے جو کچھ سن چکا تھا، اُس کی بنا پر اب میرے لیے وہی آئیڈیل تھے۔ میں اُن سے نسبت کے لیے سوچتا تو ''نوری'' اور ''مصلحی'' کے الفاظ ذہن میں آتے تھے، لیکن ذوق اُنھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ اِسی حیص بیص میں تھا کہ دو بزرگ ہمارے ہاں مہمان ہوئے۔ والد کا معمول تھا کہ بارہا مہینوں کے لیے سیلانی فقیروں، اطبا اور سنیاسیوں کو اپنے ہاں مہمان ٹھیرا لیتے تھے۔ یہ لوگ بھی اِسی طرح آئے۔ اِن میں سے ایک والد کے پیر بھائی غلام رسول وحشی اور دوسرے کوئی عالم اور سنیاسی تھے جن کا نام عبداللہ تھا۔ وحشی بہت اچھے کاتب تھے۔ اُنھوں نے اپنے شیخ کی کتاب ''لیلیٰ مجنوں'' اپنے ہاتھ سے لکھی تھی۔ وہ اِسے سناتے اور اِس کی شرح و وضاحت میں تصوف کے اسرار و رموز بیان کرتے تھے۔ عبداللہ صاحب کی دل چسپی عرب جاہلی کی تاریخ سے تھی۔ وہ اِس کے واقعات والد کو سناتے تھے۔ میں اِن بزرگوں کی مجلس میں گھنٹوں بیٹھتا اور بڑی دل چسپی کے ساتھ اُن کی باتیں سنتا تھا۔ عبداللہ صاحب نے اِنھی مجلسوں میں کوئی قصہ سناتے ہوئے بیان کیا کہ بنو غامد کے ابوالآبا نے صدیوں پہلے کسی معاملے پر پردہ ڈالا اور اِس طرح اصلاح احوال کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ اِسی بنا پر اُنھیں ''غامد'' کا لقب دیا گیا اور 'غمد الامر' کے الفاظ اِس کے بعد عربی زبان میں 'اصلح الامر' کے معنی میں استعمال ہونے لگے۔ اُنھوں نے بتایا کہ یہ قبیلہ جزیرہ نماے عرب میں اِسی نسبت سے غامدی کہلاتا ہے*۔ مجھے فوراً خیال ہوا کہ یہی کام تو میرے دادا

کرتے تھے۔ اِس کے لیے یہ نئی تعبیر علم میں آئی تو بے حد مسرت ہوئی۔ والد سے ذکر ہوا تو اُنھوں نے بھی پسند کیا۔ میں ضلع ساہیوال کے جس دیہاتی ماحول میں رہتا تھا، وہاں اِس طرح کا نام مذاق بن جاتا۔ اِس لیے میں نے اِسے لکھنا تو بہت بعد میں شروع کیا، لیکن اُسی دن فیصلہ کرلیا کہ یہ لفظ اب میرے نام کا حصہ بن جائے گا۔

بچپن، لڑکپن اور اوائل شباب کی خوشیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بعد میں سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ کس چیز نے علم وعمل اور فکر وخیال میں کیا اہمیت حاصل کر لی تھی۔ دادا کے ساتھ نسبت کے لیے یہ لفظ مل جانے سے جو خوشی مجھے اُس وقت ہوئی، اُسے میں آج بھی لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ وقت کس طرح بدلتا ہے، اب بڑی سے بڑی بات بھی دل ودماغ میں اِس طرح کا کوئی اہتزاز پیدا نہیں کرتی۔ ایسی سب چیزیں عمر کے ساتھ کس قدر بے معنی ہوجاتی ہیں:

ہر روز ایک تازہ جہاں کی حکایتیں
اب رہ گئی ہیں قصۂ عہد شباب میں

[۲۰۰۷ء]

---

* اِس کے بعد لغت کی کتابیں دیکھیں تو اِس کی تصدیق ہوئی۔ چنانچہ ''اقرب الموارد'' میں ہے: (غامدة) ابو قبيلة ينسب اليها الغامديون، وقيل: هو غامد واسمه عمرو ولقب به لاصلاحه امرًا كان بين قومه۔

روداد سفر

میں اسکول میں پڑھتا تھا، لیکن والد اِس پر مطمئن نہ تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اِس کے ساتھ عربی، فارسی اور سنسکرت بھی سیکھوں۔ اِس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اِسی دوران میں اُنھوں نے پاک پتن کے نواح میں واقع میاں محمد حسین بودلہ کی جاگیر پر ملازمت کر لی۔ دو تین مہینے وہاں کام کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے تو والدہ نے بھی اُن کے ساتھ میاں صاحب کے گاؤں ناگپال منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ گاؤں سمہ سٹہ جانے والی ریلوے لائن کے اسٹیشن پکا سدھار سے دو ڈھائی میل کے فاصلے پر تھا۔ مجھے پاک پتن کے ایم۔ سی پرائمری اسکول سے اٹھا کر پکا سدھار کے اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ یہ ایک ہی کمرے کا اسکول تھا جس میں ٹاٹ بھی نہیں تھے۔ ہم ریلوے لائن کے ساتھ بیابان کی جھاڑیوں سے شاخیں توڑتے، اُن کے پتوں سے فرش کی صفائی کرتے اور اُنھی پر بیٹھ جاتے تھے۔ گاؤں میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ والد اُس میں نماز کے لیے جاتے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے تھے۔ مولوی نور احمد صاحب اُس مسجد کے امام اور خطیب تھے۔ اب جو کچھ یاد ہے، اُس سے یہی خیال ہوتا ہے کہ اُن کا تعلق غالباً دیوبندی مسلک سے تھا۔ والد نے اُن سے میری تعلیم کی بات کی تو اُنھوں نے فرمایا: عربی، فارسی تو اِسے میں پڑھا دوں گا۔ والد بے حد خوش

ہوئے۔ پھر والدہ کے مشورے سے فیصلہ کیا گیا کہ اسکول سے آنے کے بعد میں تھوڑی دیر کے لیے آرام کروں گا۔ اِس کے بعد عصر کی نماز کے لیے مسجد جاؤں گا اور مغرب تک مولوی صاحب مجھے فارسی، عربی پڑھائیں گے۔

ہم نانگپال گئے تھے تو میں تیسری جماعت میں تھا۔ پانچویں تک مولوی نور احمد صاحب سے پڑھنے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اُنھوں نے مجھے ''شرح جامی'' تک عربی اور ''پندنامہ'' شیخ عطار تک فارسی پڑھائی۔ پانچویں جماعت کے امتحانات ہونے کو تھے کہ والد کسی بات پر میاں صاحب سے ناراض ہوئے اور ملازمت چھوڑ کر واپس پاک پتن آ گئے۔ مجھے بھی آنا پڑا، لہٰذا مولوی صاحب سے میری تعلیم بھی اِس کے ساتھ ہی منقطع ہوگئی۔ تاہم شوق ختم نہیں ہوا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ شوق در ہر دل کہ باشد رہبرے درکار نیست، میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود ہی کسی استاد تک پہنچ جاتا اور اُس کی رہنمائی میں درس نظامی کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ نویں جماعت تک میں نے فنون کی تمام کتابیں ختم کر لیں۔ اب دسویں کا امتحان درپیش تھا، اِس لیے پوری توجہ اُس کی طرف مبذول ہوگئی اور عربی تعلیم کا سلسلہ ایک مرتبہ پھر ٹوٹ گیا۔

پانچویں جماعت کا امتحان پاس کر لینے کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے میں اسلامیہ ہائی اسکول میں آ گیا تھا۔ یہاں غالباً چھٹی یا ساتویں کے زمانے میں نصیر الدین صاحب ہمایوں سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ ہمیں تاریخ پڑھاتے تھے۔ یہ اِس لحاظ سے بڑی اہم ملاقات تھی کہ پہلی مرتبہ اُنھی کی وساطت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی

کے نام اور کام سے میرا تعارف ہوا۔ مولانا کی تمام کتابیں میں نے اُن سے لے کر پڑھیں۔ یہ علم و عمل کی ایک نئی دنیا تھی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کا سالانہ اجتماع اُنھی دنوں داؤد گارڈن، داروغہ والا میں منعقد ہوا۔ ہم چند دوست بھی اسلامیہ ہائی اسکول سے ہمایوں صاحب کے ساتھ اِس اجتماع میں شرکت کے لیے لاہور آئے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کو میں نے پہلی مرتبہ اِسی اجتماع کے موقع پر دیکھا۔ کیا دل نواز شخصیت تھی۔ لگتا تھا کہ اِس کی صورت گری میں حسن فطرت کی ہر چیز کام آ گئی ہے۔ بعد میں اُن سے ملنے اور بہت قریب رہ کر اُن کو دیکھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ علم و عمل، حسن اخلاق، دانش و بصیرت اور جرأت و عزیمت کے لحاظ سے جن شخصیتوں کے نام اُن کے ساتھ لے سکتے ہیں، وہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ یہ صرف میرا تاثر نہیں ہے۔ اُنھیں دیکھنے، ملنے، اُن سے ہم کلام ہونے اور اُن کے ساتھ کام کرنے کی سعادت جن لوگوں کو بھی حاصل ہوئی ہے، وہ اِس کی گواہی دیں گے:

نہ من براں گل عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزارانند

دسویں کا سال شروع ہوا تو فلسفہ، تصوف، ادب اور تاریخ کی کتابیں دیکھنے سے میری دل چسپی بہت بڑھ چکی تھی۔ یہ والد اور اُن سے ملنے والوں کی صحبت کا اثر تھا۔ اِن مضامین کی کوئی کتاب مل جاتی تو ختم کیے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ اِس کے لیے وقت بھی تھا۔ اسکول کی مصروفیت، البتہ کسی حد تک رکاوٹ بنتی تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ اِس

سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کرنی چاہیے۔ اِسی شوق میں ایک دن اپنے استاد اور اسکول کے صدر مدرس سید شیر محمد صاحب سے میں نے درخواست کی کہ مجھے اسباق میں حاضری سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ میں پوری یک سوئی کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے ہاسٹل میں ایک کمرا دے دیں تو دسویں کے نتیجے سے بھی ان شاءاللہ میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ سید صاحب بڑی غیر معمولی شخصیت کے استاد تھے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیسے مان گئے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اُنھوں نے فرمایا: میرے اعتماد کو ٹھیس تو نہیں پہنچاؤ گے؟ میں نے اطمینان دلایا تو اُنھوں نے اگلے ہی دن یہ سہولت فراہم کر دی، بلکہ اِس کے ساتھ ایک مزید عنایت یہ کی کہ اسکول کی لائبریری سے میرے ذوق کی تمام کتابیں بھی اُسی کمرے میں منتقل کر لینے کی اجازت دے دی۔ یہ گوشۂ چمن تو نہیں تھا، مگر 'فراغتے و کتابے' کی ہر صورت میسر ہو گئی تھی۔ دسویں کے امتحانات تک میں اُسی کمرے میں رہا۔ یہ دن یاد آتے ہیں تو سید صاحب بھی ساتھ ہی یاد آتے ہیں۔ میں اُن کا مرقع کھینچنا چاہوں بھی تو نہیں کھینچ سکتا، اِس لیے کہ تشبیہ و تمثیل کے لیے اب اُن جیسے استاد کہاں ملیں گے:

اے تو مجموعۂ خوبی، بچہ نامت خوانم

دسویں کے بعد میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوا۔ فلسفہ اور انگریزی ادب میرے اختیاری مضامین تھے۔ بی۔ اے کے ساتھ آنرز کے لیے بھی میں نے انگریزی ادب ہی کا انتخاب کیا۔ گورنمنٹ کالج اُس زمانے میں علم و ادب کے درخشندہ

ستاروں کی کہکشاں بنا ہوا تھا۔ پروفیسر مرزا منور، صابر لودھی، غلام الثقلین نقوی، ملک بشیر الرحمٰن، پروفیسر سراج، پروفیسر سعید شیخ، پروفیسر بختیار حسین صدیقی اور ڈاکٹر محمد اجمل جیسے علما و ادبا کی صحبتیں طالب علموں کو میسر تھیں۔ پروفیسر اشفاق علی خان کالج کے پرنسپل تھے۔ پڑھنے والوں کے لیے کالج میں ایک بہت اچھی لائبریری تھی۔ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری اور پنجاب پبلک لائبریری بھی زیادہ دور نہ تھیں۔ اُس زمانے کا لاہور خود ایک جہان علم تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ابوالخیر مودودی، مولانا حنیف ندوی، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا عطاء اللہ حنیف، ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، پروفیسر علم الدین سالک، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، فیض احمد فیض، شورش کاشمیری، حفیظ جالندھری، عابد علی عابد، احسان دانش اور احمد ندیم قاسمی جیسے اساطین علم و ادب زندہ تھے اور آدمی جب چاہے، اُن سے استفادے کے لیے اُن کی خدمت میں حاضر ہو سکتا تھا۔

اِن میں سے بعض بزرگ تدریس کے لیے بھی آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق صاحب سے میں نے درخواست کی تو اُنھوں نے ''مقامات ہمدانی'' اور مولانا عطاء اللہ صاحب حنیف نے ''دارمی'' کا کچھ حصہ پڑھا دیا۔ مولانا اہل حدیث کے ایک جلیل القدر عالم اور ڈاکٹر صاحب عربی زبان و ادب کے ایک جید عالم اور محقق تھے۔ اُن کے والد مولانا اصغر علی روحی شبلی و فراہی کے استاد اور ''حماسہ'' اور ''سبع معلقات'' کے شارح ادیب الہند مولانا فیض الحسن سہارن پوری کے تلمیذ رشید تھے۔

ڈاکٹر صاحب زبان وادب کی اِسی روایت کے امین تھے۔

میں گورنمنٹ کالج میں کم وبیش پانچ برس رہا۔ میرا معمول تھا کہ صبح گھر سے نکلتا، کالج کے اسباق میں شامل ہوتا، پھر شام تک کسی لائبریری میں بیٹھا رہتا یا لائبریری سے اٹھ کر اِن بزرگوں کی صحبت میں پہنچ جاتا تھا۔ نئی کتابوں کے لیے فیروزسنز اور یونائیٹڈ پبلشرز میں یہ سہولت تھی کہ آدمی جب تک چاہے پڑھتا رہے، دکان کے لوگ بالعموم کوئی مداخلت نہیں کرتے تھے۔ میں اِن دکانوں پر بھی جاتا اور گھنٹوں کتابیں دیکھتا رہتا تھا۔ اُس زمانے میں بعض کتابیں لکھنے کے منصوبے بنائے، کچھ لکھا بھی، لیکن یہ زیادہ تر منصوبے ہی رہے۔ شعر کہنے کا رجحان بچپن سے تھا۔ وہ اُس زمانے میں بھی کہے اور اُن میں سے کچھ فیروزسنز کے انگریزی ماہنامہ ''پاکستان ریویو'' کے ۱۹۶۸ء، ۱۹۶۹ء کے شماروں اور بعض دوسرے مجلوں میں شائع بھی ہو گئے، مگر زیادہ توجہ پڑھنے کی طرف رہی۔ لہٰذا کالج کے شب وروز اِسی عیش میں گزر گئے:

اوقات ہماں بود کہ با یار بسر رفت
باقی ہمہ بے حاصلی و بے خردی بود

آنرز حصۂ اول کا امتحان پاس کر لینے کے بعد میں اُس کے آخری سال میں تھا کہ امام حمیدالدین فراہی کی بعض کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ علم ونظر اور فہم وبصیرت کی ایک حیرت انگیز دنیا تھی جو اِن کتابوں کے اوراق پلٹتے ہی سامنے آ گئی۔ اِن میں سے کسی کتاب کے دیباچے میں امام کے تلمیذ رشید مولانا امین احسن اصلاحی کا ذکر بھی

تھا۔ اُس کے الفاظ غالباً یہ تھے: 'ثانی اثنین اذ ھما یتادبان بآداب الامام الفراھی'۔ میرے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ مولانا سے ملاقات کی جائے۔ ''اسلامی جمعیت'' کے ایک دوست نے بتایا کہ وہ لاہور سے باہر کسی گاؤں میں مقیم ہیں۔ اتنا معلوم تھا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا بھی اُن سے کچھ تعلق ہے۔ ڈاکٹر صاحب اُس زمانے میں کرشن نگر کے کسی محلے میں مطب کرتے اور وہیں رہتے تھے۔ میں لائبریری سے اٹھا اور پوچھتے پوچھتے اُن کے گھر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب مطب کے پچھلے کمرے میں اپنے احباب سے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے مولانا کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے بتایا کہ حسن اتفاق سے وہ آج ہی اپنے گاؤں رحمٰن آباد سے آئے ہیں اور اِس وقت اپنے داماد نعمان علی صاحب کے ہاں واپڈا کالونی میں ٹھیرے ہوئے ہیں۔ میرے پاس سائیکل تھی۔ میں نے پتا سمجھا اور واپڈا کالونی کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو مغرب کا وقت ہو رہا تھا۔ راہ چلتے ایک صاحب سے رہنمائی چاہی تو اُنھوں نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ مولانا نماز کے لیے باہر نکل رہے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ یہ استاذ امام سے میری پہلی ملاقات تھی۔ مولانا غالباً دو ہفتے لاہور میں رہے۔ میں روزانہ ملاقات کے لیے حاضر ہوتا اور ایک نئی دنیا کی سیر دیکھ کر لوٹتا۔ استاذ امام کے ساتھ یہی ملاقاتیں ہیں جن سے پہلی مرتبہ شرح صدر ہوا کہ دین محض مان لینے کی چیز نہیں ہے، اُسے سمجھا اور سمجھایا بھی جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت واضح ہوئی کہ قرآن ایک قول فیصل ہے، دین و شریعت کی ہر چیز کے لیے میزان ہے، پورے عالم کے لیے خدا کی حجت ہے۔ اِس کی روشنی میں ہم حدیث و فقہ،

فلسفہ وتصوف اور تاریخ وسیر، ہر چیز کا محاکمہ کر سکتے ہیں۔

یہ میرے لیے ایک نئے قرآن کی دریافت تھی۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کے طریقے پر قرآن کا طالب علم بننا چاہتا ہوں۔ اپنی تعلیم کا کچھ پس منظر بتا کر پوچھا کہ اِس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟ مولانا نے مختلف علوم وفنون کی امہات کتب کی ایک لمبی فہرست بتائی جنھیں پڑھنے، سمجھنے اور دل ودماغ میں اتارنے کے لیے برسوں کی محنت چاہیے تھی۔ مولانا نے فرمایا: اِس طریقے سے پڑھنا چاہتے ہو تو لیڈری کے خیالات ذہن سے نکال کر علم ونظر اور فکر وتدبر کے لیے گوشہ گیر ہونا پڑے گا۔ یہ فیصلہ کرو کہ تمھارا سایہ بھی ساتھ نہ دے تو حق پر قائم رہو گے۔ ہمارے مدرسۂ علمی میں کوئی شخص اِس عزم وارادہ کے بغیر داخل نہیں ہوسکتا۔

یہ آخری دن تھا۔ اِس سے اگلے روز مولانا گاؤں واپس جا رہے تھے۔ میں نے دل ودماغ کا جائزہ لیا، نتائج وعواقب کا اندازہ کیا اور اُسی روز فیصلہ کر لیا کہ کالج کو الوداع کہہ کر میں کل ہی مولانا کے مدرسۂ علمی میں داخل ہو جاؤں گا اور اِس کے لیے جیسا علم چاہیے، اُسے حاصل کرنے میں اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھوں گا۔

میری طالب علمی کا دوسرا دور اِسی سے شروع ہوا۔ یہ ۱۹۷۳ء کی ایک شام تھی۔ اِس کے بعد یہ سلسلہ کم وبیش دس سال تک جاری رہا۔ اِس دوران میں مولانا نے خود بھی پڑھایا۔ سورۂ زخرف سے آخر تک قرآن مجید، موطا امام مالک، قرآن وحدیث پر تدبر کے اصول ومبادی اور فلسفۂ جدید کے بعض مباحث اُن کے طریقے پر اُنھی سے پڑھے۔ مولانا فرماتے تھے کہ پڑھے کم لکھے زیادہ لوگ اِس زمانے میں بہت

ہو گئے ہیں۔ اُن کا ارشاد تھا کہ قلم اُس وقت اٹھایے، جب کوئی نئی حقیقت سامنے آئے۔ چنانچہ طالب علمی کے اِس دور میں لکھنے کی ہمت کم ہی ہوئی۔ میں شعر کہتا تھا، نثر لکھنے سے مجھے کچھ زیادہ دل چسپی بھی نہیں تھی۔ تاہم چند چیزیں اردو اور عربی زبان میں قلم سے نکلیں، لیکن وہ ایسی ہی تھیں، جیسی کسی نوآموز لکھنے والے کی ہوسکتی ہیں۔

۱۹۸۳ء میں تعلیم کا یہ مرحلہ ختم ہوا تو میرے معتقدات کی دنیا میں ایسا اضطراب پیدا ہو چکا تھا کہ ہر چیز اپنی جگہ چھوڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ فقہ، اصول فقہ، تصوف، علم کلام، سب قرآن میں اپنی بنیادیں تلاش کر رہے تھے۔ دین کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ اِس سوال کے جتنے جوابات ابھی تک سامنے تھے، وہ سب اعتراضات کی زد میں تھے۔ میرے تصورات کا قصر منہدم ہو چکا تھا اور نئی تعمیر اب نئے بندوبست کا تقاضا کر رہی تھی۔ اگلے سات سال اِسی بندوبست کی نذر ہو گئے۔ اِس عرصے میں، معلوم نہیں، کتنی وادیاں قطع کیں، کتنے راستے ڈھونڈے، کتنے موڑ مڑے، کتنے پتھر الٹے، اور پاؤں کے آبلوں سے کہاں کہاں کانٹوں کی پیاس بجھائی۔ یہ عجیب سفر تھا۔ ایک کے بعد دوسری منزل گزر رہی تھی اور کچھ معلوم نہ تھا کہ آگے کیا پیش آنے والا ہے۔ فیضی نے غالباً اِسی طرح کی صورت حال میں کہا تھا:

کس نمی گویدم از منزل اول خبرے
صد بیاباں بہ گذشت و دگرے در پیش است

اِس زمانے میں اگر کچھ لکھا بھی تو کسی ضرورت کے تحت۔ بت کدۂ تصورات میں 'تراشیدم، پرستیدم، شکستم' کی جو صورت پیدا ہوگئی تھی، اُس میں دوسروں سے کیا کہا جائے؟ یہ دور اِسی طرح گزر گیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۰ء میں جا کر وہ زمین کہیں ہموار ہوئی، جہاں نئی تعمیر کے لیے نیو ڈالی جائے۔ زندگی کے چالیس سال پورے ہونے کو تھے۔ فکر و خیال میں بڑی حد تک وضوح پیدا ہو چکا تھا اور نقشۂ کار بھی واضح تھا۔ میں نے تصنیف و تالیف کا ایک پروگرام ترتیب دیا اور اِس کے مطابق کام کی ابتدا کر دی۔ پچھلے سترہ سال سے اِسی کے مطابق کام کر رہا ہوں۔ بہت کچھ ہو چکا اور بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو یہ بھی ہو جائے گا۔ چند دن پہلے ''میزان'' پایۂ تکمیل کو پہنچی تو خیال ہوا کہ اِس موقع پر یہ داستان سنا دی جائے۔ اِسی تقریب سے اپنے کام کا نقشہ یہاں بیان کر رہا ہوں۔ یہ کتابیں ہیں جن میں سے کچھ لکھی جا چکی اور کچھ زیر تصنیف ہیں:

۱۔ البیان

قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر ہے۔

۲۔ میزان

اسلام کو میں نے جس طرح سمجھا ہے، یہ اُس کا بیان ہے۔

۳۔ برہان

یہ اُن مباحث کی تنقیح کے لیے خاص ہے، جہاں میرا نقطۂ نظر دوسرے علما سے

مختلف ہے۔

۴۔مقامات

پہلی دو کتابوں کے علاوہ جو کچھ لکھا ہے یا لکھنے کا ارادہ ہے، اُس کے منتخبات اِس کتاب میں جمع کرنا پیش نظر ہے۔

۵۔الاسلام

''میزان'' کا خلاصہ ہے۔

۶۔علم النبی

۷۔فقہ النبی

۸۔سیرۃ النبی

یہ تینوں کتابیں احادیث وآثار کی جمع وتدوین اور اُن کے متون کی تنقیح کے لیے ترتیب دینا چاہتا ہوں۔

۹۔خیال وخامہ

شعر کہتا رہا ہوں، یہ اُن کا مجموعہ ہے۔

''برہان''، ''مقامات'' اور ''خیال وخامہ'' شائع ہو چکی ہیں۔ اِن میں مضامین اور منظومات کا اضافہ، البتہ ہوتا رہتا ہے۔ ''میزان''، امید ہے کہ اِس سال کے آخر تک شائع ہو جائے گی۔ ''البیان'' میں سورۂ نساء تک پہنچا ہوں۔ اِس سے فارغ ہو گیا تو باقی عمر ان شاء اللہ حدیث کی خدمت کے لیے وقف کر دوں گا۔ زندگی کی تمنا اگر ہے تو

اب اِسی کے لیے ہے۔ ابوالکلام کا تصرف قبول کرلیا جائے تو زمانی یزدی کا یہ شعر ہر لحاظ سے حسب حال ہے:

حکایت از قد آں یار دل نواز کنیم
بایں فسانہ مگر عمر خود دراز کنیم

[۲۰۰۷ء]

قافلہ در قافلہ

میں نے جس دور میں شعور کی آنکھ کھولی، وہ اسلامی انقلاب کے لیے قائم ہونے والے اداروں اور تنظیموں کا دور تھا۔ انسان اپنے گردوپیش سے متاثر ہوتا ہے۔ چنانچہ کالج کے زمانے میں ہم چند دوستوں نے بھی ''دائرۃ الفکر'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُن میں یارعزیز ڈاکٹر ساجد علی سب سے نمایاں تھے۔ وہ اِس وقت پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے سربراہ ہیں۔ لنک میکلوڈ روڈ پر میرے پاس کرایے کا ایک کمرا تھا۔ ماہنامہ ''خیال'' کے نام سے میں وہاں سے ایک رسالہ شائع کرنا چاہتا تھا۔ اِس ادارے کی ابتدا اِسی کمرے سے ہوئی۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی انقلاب کے لیے ایک تحریک برپا کی جائے جس میں یہ ادارہ ایک علمی مرکز اور مرکز قیادت کی حیثیت سے کام کرے۔ اِس کے بعد ایک دارالعلوم قائم کرنے کا ارادہ

تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ اِس دارالعلوم سے جو لوگ پڑھ کر نکلیں، آیندہ کے لیے تحریک کی قیادت اُنھی میں سے منتخب کی جائے۔ یہ ایک رومانوی تصور تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی جماعت میں جو خامی رہ گئی ہے، وہ اِسی طرح دور کی جاسکتی ہے۔ دو تین ماہ تک ہم لنک میکلوڈ روڈ کے اِس کمرے میں ملتے اور پڑھتے پڑھاتے رہے، لیکن اندازہ ہوا کہ پیش نظر مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت اکٹھے گزارنا ضروری ہے۔ چنانچہ اُن دوستوں نے، جو ہاسٹل میں رہتے تھے، فیصلہ کیا کہ وہ ہاسٹل چھوڑ دیں گے اور اپنا سب جیب خرچ اور ہاسٹل کے اخراجات کے لیے ملنے والی رقم ملا کر ایک مکان کرایے پر لیں گے، جہاں اِس تحریک کا مرکز قائم کیا جائے گا۔ میرا گھر اُس زمانے میں لاہور ریلوے اسٹیشن کے پاس محلّہ سلطان پورہ میں تھا۔ تلاش شروع ہوئی تو ایک مکان قریب ہی مل گیا اور یہ سب دوست وہاں منتقل ہو گئے۔

ہم جو دارالعلوم قائم کرنا چاہتے تھے، اُس کا نام ہم نے ''جامعہ الحمرا'' تجویز کیا تھا۔ اِس کی رعایت سے ''الحمرا'' کے نام سے ایک مجلّہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ دوستوں کے مشورے سے طے ہوا کہ اِس کے لیے کتابت کے بجاے ٹائپ پر چھاپنے کا طریقہ اختیار کیا جائے، جس میں حروف جوڑ کر عبارت تیار کی جاتی ہے۔ جن لوگوں کو اِس طریقۂ طباعت کا تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ اِس میں پروف کی غلطیاں بہت ہوتی تھیں جنھیں دقت نظر سے درست کرنا پڑتا تھا۔ ہمارے ساتھ حادثہ یہ ہوا کہ پروف دیکھ کر ہم پریس والوں کے حوالے کر آئے اور مطمئن ہو گئے کہ غلطیوں کی تصحیح ہو

جائے گی۔ مگر مجلّہ چھپ کر آیا تو معلوم ہوا کہ جن غلطیوں کی نشان دہی کی گئی تھی، اُن میں سے کوئی غلطی بھی درست نہیں ہوئی۔ اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ اُسے ضائع کر دیا جائے۔ یہ پہلا حادثہ تھا جس سے اپنی ناتجربہ کاری کے باعث دوچار ہونا پڑا۔ ابھی اِس کی پریشانی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور افتاد آ پڑی۔ چند ہی مہینوں کے بعد ہمیں وہ مکان خالی کرنا پڑا جس میں اپنی تحریک کا ایک مرکز ہم نے قائم کر لیا تھا۔ نیا مکان کئی مہینوں کی تگ و دو سے ملا۔ یہ ماڈل ٹاؤن کے جے بلاک میں ۲۹ نمبر مکان تھا۔ ہم نے خدا کا شکر کیا کہ تعطل کا زمانہ زیادہ طویل نہیں ہوا اور کام ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا ہے۔

۱۹۷۱ء کے جون میں ہماری ملاقات لاہور کے ایک ایڈووکیٹ چودھری محمد انور صاحب سے ہوئی۔ اُن کے ایک بزرگ دوست سید بدر بخاری بھی اِس ملاقات کے موقع پر موجود تھے۔ یہ دونوں ہمارے پروگرام سے بہت متاثر ہوئے۔ اُن کی تجویز تھی کہ اِس کام کو آگے بڑھانے کے لیے علامہ اقبال روڈ پر اُن کے محلے میں درس قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا جائے۔ ۷/ جولائی کو یہ حلقہ قائم ہوا اور اس کے نتیجے میں ہم طالب علموں کو چند بڑوں کی سرپرستی بھی حاصل ہو گئی۔ اِن میں سید ارشد بخاری اور شیخ محمد ارشد سب سے نمایاں تھے۔ یہ دونوں دوست تھے اور واپڈا میں ملازمت کرتے تھے۔ اِس سے پہلے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درسوں میں بڑی باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اِن دونوں کو ''ارشدین'' کہا کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو برس تک درس و

تدریس کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اب کافی لوگ ہمارے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار تھے۔ لہٰذا سید بدر بخاری کی امارت میں تحریک کا باقاعدہ نظم قائم کر دیا گیا۔ اہل حدیث کے ایک ممتاز عالم مولانا عبدالرحمٰن صاحب مدنی ہمارے قریب ہی رہتے تھے۔ وہ بھی اُس میں شامل ہو گئے۔ درس کے بعض دوسرے شرکا نے بھی اُس میں شمولیت اختیار کر لی۔ تاہم یہ سلسلہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہا۔ بدر بخاری صاحب عمر کے اُس حصے میں تھے کہ اِس طرح کے کسی نظم کی قیادت اُن کے لیے آسان نہ تھی۔ لہٰذا چند مہینوں کے اندر ہی باہمی مشورے سے یہ تنظیم ختم کر دی گئی۔

مارچ ۱۹۷۳ میں ہم نے ''دائرۃ الفکر'' سے ایک مجلّہ ''اشراق'' کے نام سے چھاپا۔ ہمارا خیال تھا کہ ڈیکلریشن مل جائے گا تو اِسے ایک باقاعدہ رسالے کی صورت دے دیں گے اور اِس کے ذریعے سے اپنی بات لوگوں تک پہنچائیں گے، لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ ڈیکلریشن ملنا آسان نہیں ہے۔ اِس لیے یہ اسکیم روبہ عمل نہ ہو سکی۔ اِس کے چند ماہ بعد ہمارے مالک مکان نے کرایہ بڑھانے کا مطالبہ کر دیا۔ اُس وقت کے حالات میں ہمارے لیے ممکن نہ تھا کہ اُس کا مطالبہ پورا کرتے، اِس لیے ماڈل ٹاؤن کا یہ مکان بھی چھوڑنا پڑا۔ اِس کے بعد کئی مہینے تک ہم لوگ منتشر رہے۔ ادارہ بھی معطل رہا۔ خدا خدا کر کے گارڈن ٹاؤن کے احمد بلاک میں ایک مکان ملا۔ دوست جمع ہوئے، ساز و سامان درست کیا گیا اور پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

ہمارے بعض دوستوں کو ''دائرۃ الفکر'' کا نام پسند نہیں تھا۔ چنانچہ اِس کی جگہ ادارے کے لیے ''دارالاشراق'' کا نام اختیار کیا گیا۔ ابتدا میں جو طالب علم اِس سے متعلق ہوئے تھے، اُن میں سے میں اور ساجد علی ہی باقی تھے۔ شیخ افضال احمد، مستنصر میر، چودھری الیاس احمد اور چودھری محمد رفیق نئے رفقا تھے۔ ہمارے دوست ذوالفقار احمد خاں بھی اِسی دور کی یادگار ہیں۔ وہ ہمارے قریب ہی رہتے تھے، اور اگرچہ ادارے سے متعلق نہیں تھے، مگر اُسی کے ایک فرد سمجھے جاتے تھے۔ یہی معاملہ اصغر نیازی اور محمد طارق میکن کا بھی تھا۔ یہ دونوں دوستانہ تعلق سے ہمارے پاس مقیم تھے۔

اُس زمانے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی خدمت میں بھی اکثر حاضر ہونے کا موقع ملتا تھا۔ ایک روز ملاقات کے لیے گیا تو اِس کام کا بھی ذکر ہوا۔ مولانا نے تفصیلات پوچھیں، رفقا سے تعارف حاصل کیا، میں نے اپنی مشکلات بتائیں، وہ موانع بیان کیے جو کام میں تعطل کا باعث بن جاتے تھے اور اُن سے سرپرستی کی درخواست کی۔ مولانا نے میری یہ درخواست ازراہ عنایت قبول فرمالی۔ چنانچہ اُن کی ہدایت کے مطابق ادارے کے لیے میرے اور مولانا کے نام سے ایک مشترک اکاؤنٹ اچھرہ کے حبیب بنک میں کھولا گیا جس میں مولانا نے اپنی جیب سے ماہانہ ایک ہزار روپے جمع کرانے شروع کر دیے۔ احمد بلاک سے ہم لوگ مولانا کے گھر کے پاس اُنھی کی دی ہوئی ایک عمارت ا۔اے ذیلدار پارک اچھرہ میں منتقل ہو گئے۔ مولانا کا خیال تھا کہ اِسے ''ادارۂ معارف اسلامی'' کی ایک شاخ یا ایک نئے ادارے کی

حیثیت سے منظّم کیا جائے گا۔ اِس سے پہلے مولانا ہی کے ایما سے میں ''جماعت اسلامی'' کا رکن بن چکا تھا، لیکن مولانا کا یہ فیصلہ جماعت کے بعض بزرگوں کو پسند نہیں آیا۔ چنانچہ ایک مہم شروع ہوئی اور سات آٹھ مہینے کے بعد ہی میں نے محسوس کر لیا کہ اِن حالات میں یہاں رہ کر کام کرنا ممکن نہ ہوگا۔ جماعت کی یہ خواہش بھی اسلم سلیمی صاحب نے مجھ تک پہنچا دی تھی کہ ادارہ جس عمارت میں قائم ہے، اُسے وہ الیکشن کا دفتر بنانا چاہتی ہے۔ یہ صورت حال بتا رہی تھی کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ لہٰذا ہم نے مشورہ کیا، مولانا سے اجازت چاہی اور چودھری الیاس احمد کی دعوت پر لاہور کے قریب ہی واقع اُن کے گاؤں مرید کے منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۷۶ء کے آخر میں ہم یہاں پہنچے اور ۱۱ رجنوری ۱۹۷۷ کو جماعت اسلامی پنجاب کے امیر مولانا فتح محمد صاحب کا ایک خط موصول ہوا جس میں اُنھوں نے مطلع کیا تھا کہ جماعت سے میری رکنیت ختم کر دی گئی ہے۔ یہ ایک دو سطروں کی تحریر تھی جس میں بغیر کوئی وجہ بتائے فیصلہ سنا دیا گیا تھا کہ میں اب جماعت کا رکن نہیں رہا۔ میاں طفیل محمد صاحب اُس زمانے میں جماعت اسلامی پاکستان کے امیر تھے۔ میں نے اُن کے نام خط لکھا اور اِس فیصلے کے وجوہ معلوم کرنا چاہے، مگر اِس کا کوئی جواب مجھے کبھی نہیں دیا گیا۔

یہ وصل و فصل میرے لیے زندگی کا ایک اہم تجربہ تھا۔ میں نے اِس عرصے میں اپنے عہد کی ایک عظمت کو بہت قریب سے دیکھا، اُن کے ساتھ کھڑے ہو کر نمازیں پڑھیں، اُن سے باتیں کیں، زندگی کے آداب سیکھے، صبر و حکمت کا درس لیا، زبان و بیان

کی بعض نزاکتیں سمجھیں، ماچھی گوٹ سے پہلے اور بعد میں جو کچھ ہوا، اُس کے بارے میں اُن کا نقطۂ نظر خود اُن کی زبان سے سنا، مولانا اصلاحی کے ساتھ اُن کے علمی اختلافات پر اُن سے تبادلۂ خیالات کیا۔ امام فراہی کے متعلق اُن کے عقیدت مندانہ تاثرات سنے، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور علامہ اقبال سے اُن کی محبت کی داستان سنی۔ یہ صحبتیں سرمایۂ حیات ہیں اور میں اب بھی مولانا کو اُسی طرح یاد کرتا ہوں، جس طرح ایک مہجور بیٹا اپنے باپ کو یاد کرتا ہے۔ اُن کی جماعت کو بھی میں اپنی برادری سمجھتا ہوں اور پالیسی اور طرزِ عمل سے ہزار اختلافات کے باوجود ایسا ہی تعلق خاطر محسوس کرتا ہوں، جس طرح کوئی شخص اپنے خاندان سے محسوس کرتا ہے۔ میرے خلاف مہم میں جو لوگ پیش پیش رہے، وہ شاید مجھے نہیں جانتے تھے، اِس لیے اُن سے بھی کوئی گلہ نہیں ہے۔ میں اُن سے حسن ظن رکھتا ہوں کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا، اپنی دانست میں جماعت کی بہتری کے لیے کیا۔ مولانا نے امریکا جانے سے پہلے آخری ملاقات میں مجھ سے کہا تھا: میری عزیز توقعات آپ سے وابستہ ہیں۔ اپنے ناقدین کی بات ہمیشہ توجہ کے ساتھ سنیے، پستی پر اتر آئیں تو 'مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا' کا طریقہ اختیار کیجیے، وہ آپ کو مشتعل کرنا چاہیں تو اُن کے افترا اور بہتان طرازی کے باوجود اشتعال میں آنے سے انکار کر دیجیے، اِس کے بعد خدا آپ کے ساتھ ہوگا اور آپ ان شاء اللہ اُنھیں اپنے میدان میں شکست دیں گے۔ زندگی کے نشیب و فراز میں مولانا کی یہ نصیحت ہمیشہ میرے پیش نظر رہی ہے۔ یہ اِسی کا اثر ہے کہ:

اِس دشت بے چراغ میں کرتا ہوں روز و شب
پیدا ہر اک ببول سے سرو و سمن کو میں

لاہور سے مرید کے آجانے کا ذکر تھا کہ مولانا کی صحبتیں یاد آگئیں اور لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔ ہمارے ایک نئے رفیق ملک محمد اشرف شادی شدہ تھے۔ یہاں آنے کے بعد میری اور میر صاحب کی بھی شادی ہوگئی۔ اب ہاسٹل کے طریقے پر رہنا ممکن نہ تھا۔ حالات میں جو تبدیلی آئی تھی، اُس کی بنا پر ضروری تھا کہ رفقا کی کفالت کے لیے کوئی معقول بندوبست کیا جائے۔ ہم نے بہت کوشش کی، مگر اِس کے لیے جتنے وسائل چاہییں تھے، وہ کسی طرح میسر نہیں ہوئے۔ لہٰذا کم وبیش دو سال تک مرید کے میں بقا کی جدوجہد کے بعد ہم اِس نتیجے پر پہنچ گئے کہ اب اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اِس ادارے کی بساط لپیٹ دی جائے۔ یہ ۱۹۷۸ء کے اپریل کی کوئی شام تھی، جب ہم نے کئی دن کی بحث وتمحیص کے بعد بالآخر فیصلہ کرلیا اور برسوں کے ساتھی بادل نخواستہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہونے لگے۔ اِس عرصے میں ''اشراق'' کا ڈیکلریشن مل گیا تھا۔ یہ مستنصر میر کے نام تھا۔ اِس کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا۔ رسالے کا اداریہ اِسی موضوع پر تھا اور میں نے اُس میں لکھا تھا:

''...نومبر ۱۹۷۰ء میں وہ اکیڈیمی وجود میں آئی جو ''دارالاشراق'' کے نام سے لاہور سے ۲۶ کلومیٹر دور مرید کے کی بستی میں اپریل ۱۹۷۸ء تک باقاعدگی سے کام کرتی رہی اور اب کئی ماہ سے معطل ہے۔ میرے کچھ رفقا برسوں کی جدوجہد کے

بعد گھروں کو لوٹ چکے ہیں، کچھ لوٹ جائیں گے۔ یہ ایک کام تھا جو شروع ہوا اور اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے سعی و جہد کے بے شمار مراحل سے گزرا اور ختم ہو گیا۔ میرے احباب کا تقاضا ہے کہ میں اِس کام کی نوعیت اور اِس کے تعطل کے وجوہ و اسباب پر قلم اٹھاؤں تا کہ وہ لوگ جو اِس کے احیا سے دل چسپی رکھتے ہیں، اگر کچھ کرنے کی ہمت رکھتے ہوں تو کر سکیں۔ میں نہیں جانتا کہ اِس کا دوبارہ آغاز کب ہو سکے گا، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میرے عزم میں کوئی کمی نہیں آئی۔ مجھے یقین ہے کہ کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ میرا احساس ہے کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ میرے پروردگار نے چاہا تو یہ قافلہ پھر گرم سفر ہوگا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ منتشر ہو گیا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ دم لینے کے لیے کسی منزل پر ٹھیر گیا ہے۔ شاید زادِ راہ لینے کے لیے، شاید نئے سفر کا آغاز کرنے کے لیے۔ میں آوازِ جرس سن رہا ہوں اور میں نے قلم اٹھا لیا ہے۔''

اِس سے آگے میں نے لکھا تھا:

''...یہ بات شروع ہی سے میرے سامنے تھی کہ یہ کوئی جز وقتی کام نہیں ہے۔ اِس کے لیے آنے والوں کو شب و روز کے لیے آنا ہوگا اور ساری زندگی کے لیے آنا ہوگا۔ مجھے معلوم تھا کہ جو لوگ اِس میں اپنا سب کچھ کھپا دینے کے لیے آئیں گے، اُن کی کفالت کی ذمہ داری بالآخر اِس ادارے کو اٹھانا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے میں نے یہ کام دو جہتوں سے شروع کیا۔ مردانِ کار کی تلاش اور وسائل کی فراہمی کی جدوجہد میں نے ایک ہی وقت میں شروع کی۔ اب میں محسوس کرتا ہوں

کہ پہلے کام کے لیے میرا مزاج موزوں تر اور دوسرے کے لیے سخت ناموزوں واقع ہوا ہے، اور اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے ارباب عزم کو جمع کر لینے میں جہاں غیر معمولی کامیابی ہوئی، وسائل کو تلاش کرنے میں ویسی ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اِس داستان کو بالتفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہ فرہاد و بیستوں کی حکایت ہے، خار مغیلاں کو خون دل سے سیراب کرنے کی کہانی ہے۔ میں اِس کو یہاں بہت اختصار کے ساتھ رقم کر رہا ہوں۔ خاطر احباب کی گراں باری کا احساس ہے، لیکن اِسے چند حرفوں میں بیان کرنے کا موقع شاید یہی ہے:

پھر التفات دل دوستاں رہے نہ رہے

یہ کام کب شروع ہوا، عرض کر چکا ہوں۔ ابتدا مشکل تھی، ہوگئی تو احباب وقتاً فوقتاً اِس کام سے متعلق ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۵ء میں اُن کی تعداد سات تک پہنچ گئی۔ اِن میں افضال احمد صاحب اور محمد اشرف صاحب نے معاشیات، ساجد علی صاحب نے فلسفہ، الیاس احمد صاحب نے سیاسیات، محمد رفیق صاحب نے عربی اور مستنصر میر صاحب نے انگریزی میں ایم۔اے تک تعلیم حاصل کی تھی۔ منصور الحمید صاحب ایم بی بی ایس تھے۔ مستنصر میر صاحب نے سی ایس ایس کیا تھا اور سول سروس اکیڈیمی میں ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد تقرر سے کچھ روز پہلے ملازمت کا خیال چھوڑ کر حلقۂ درویشاں میں شامل ہو گئے تھے۔ اِن میں سے ہر فرد کا ایثار بے مثال ہے۔ یہ بڑی صلاحیتوں کے حامل نوجوان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن کی عزیمت، اِن کا ذوق علم، اِن کا حسن طبیعت، اِن کا سوز نہاں اِس

اکیڈیمی کی تاریخ کی متاع بے بہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خود میں نے اِن سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ میرا احساس ہے کہ یہ آنے والے دور کو بہت کچھ دے سکتے تھے۔ لیکن اپنے زمانۂ قیام میں یہ شاید ہی چند ماہ کے لیے اطمینان کے ساتھ کام کر سکے ہوں۔ مالی وسائل کی کمی نے اِس کام کو بار بار معطل کیا ہے۔ اِس کی پوری تاریخ مسلسل بحران کی تاریخ ہے۔ یہاں تدریس بار بار شروع ہو کر ختم ہوئی ہے۔ اِس کے باوجود اللہ کا احسان ہے کہ کچھ کام ہو گیا اور بہت تھوڑا باقی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈیڑھ دو سال مزید کام کرنے کا موقع مل جاتا تو اِس کاوش کا مرحلۂ اول مکمل ہو جاتا۔ اب یہ سب کچھ معطل ہے اور مرید کے کی اِس ارض عقیم میں ہم خدائے لم یزل کے چند ناتواں بندے ایک نئے عزم کے ساتھ اِس کے احیا کے لیے کوشاں ہیں۔ معلوم نہیں، عرصۂ تعطل کب ختم ہوگا۔ لیکن مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس کام کو ضائع نہیں کریں گے۔''

میری جدوجہد کا پہلا مرحلہ یہاں ختم ہو گیا۔ لاہور واپس آنے کے بعد خیال تھا کہ اب صرف رسالہ نکالوں گا۔ ''اشراق'' کا ڈیکلریشن مستنصر میر کے نام پر مل گیا تھا، لیکن ابھی دو شمارے ہی نکلے تھے کہ میر صاحب کے امریکا جانے کا پروگرام بن گیا۔ پھر میرے اور اُن کے درمیان رسالے کی پالیسی کے بارے میں بھی کچھ اختلاف تھا۔ لہٰذا یہ خواہش پوری نہیں ہوئی اور ''اشراق'' ایک مرتبہ پھر بند کرنا پڑا۔

اِن دنوں چند طلبہ میرے پاس عربی ادب کی بعض کتابیں پڑھنے کے لیے آتے

تھے۔مولانا ابوشعیب صفدر علی اور مسعود اکبر پاشا اِن میں سب سے نمایاں تھے۔ابوشعیب سرگودھا کے ایک عالم اور مولانا حسین علی واں بھچراں کے شاگرد رشید مولانا غلام نقشبند کے فرزند ارجمند تھے۔اُن کی غیر معمولی صلاحیتوں کے پیش نظر میری خواہش تھی کہ وہ لاہور منتقل ہو جائیں۔مرید کے کے دورابتلا میں جن لوگوں نے ہمارے ساتھ غیر معمولی تعاون کیا، اُن میں ہماری برادری کے ایک بزرگ ڈاکٹر فرخ حسین ملک بھی تھے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو توجہ دلائی تو اُنھوں نے ''فرخ فاؤنڈیشن'' کے نام سے ایک ادارہ بنا دیا جس کے مہتمم مستنصر میر کے والد گرامی صفدر میر بنائے گئے۔اُنھوں نے میرے ہی ایما سے ایک مجلّہ ''الاعلام'' کے نام سے شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔اُس میں اگرچہ میرا نام بھی لکھا گیا، لیکن تمام عملی ضرورتوں کے لیے ابوشعیب اُس کے مدیر مقرر کیے گئے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اِس کے نتیجے میں اُن کے لیے لاہور میں قیام کے اسباب میسر ہو گئے ہیں، لیکن یہ رسالہ بھی زیادہ دنوں تک جاری نہیں رہ سکا۔ڈیڑھ دو سال بعد ہی مولانا ابوشعیب کو پنجاب یونیورسٹی میں ملازمت مل گئی اور رسالہ بند ہو گیا۔

یہی دن تھے، جب میں نے استاذ امام سے عرض کیا کہ اب حلقۂ تدبر قرآن کو بھی ایک باقاعدہ ادارے میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ یہ حلقہ اُن کی جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد قائم ہوا تھا۔مولانا نے یہ تجویز پسند فرمائی۔اُن کے ایما سے میں نے اِس کا دستور لکھا اور ''ادارۂ تدبر قرآن وحدیث'' کے نام سے یہ ادارہ قائم ہو گیا۔

سہ ماہی ''تدبر'' اِسی ادارے کے تحت شائع ہوتا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ پیش نظر مقاصد کے لیے اب اِسی میں کام کیا جائے، مگر بہت جلد واضح ہو گیا کہ حلقہ کے بزرگ اِسے پسند نہیں کریں گے۔ اِس کے بعد یہی مناسب تھا کہ کوئی کشمکش پیدا کرنے کے بجاے ادارے سے الگ ہو کر اپنے طریقے پر کام کرتا رہوں۔

اُس زمانے میں طلبہ کی ایک جماعت مجھ سے پڑھ رہی تھی۔ اُن میں ایک نعیم رفیع بھی تھے۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آتے تو بار بار اصرار کرتے کہ اُس کام کا احیا ہونا چاہیے جو ۱۹۷۸ء میں ختم ہو گیا تھا۔ پچھلے تجربات کی وجہ سے میں اِس کے لیے راضی نہ تھا۔ پھر خالد ظہیر اور آفتاب شمسی جیسے احباب بھی اُن کے ہم نوا ہو گئے تو بالآخر میں آمادہ ہوا۔ سعید نواز صاحب ہمارے دوستوں میں سب سے بزرگ تھے۔ اُن کی سربراہی میں ایک مجلس منتظمہ بنائی گئی۔ اِس کی افتتاحی تقریب استاذ امام امین احسن اصلاحی کے زیر صدارت لاہور کے جناح ہال میں منعقد ہوئی جس میں ارباب علم و دانش کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی اور جون ۱۹۸۳ میں وہ ادارہ وجود میں آ گیا جو اب ''المورد'' کے نام سے ۵۱ کے ماڈل ٹاؤن میں قائم ہے۔ اِس کے کچھ عرصہ بعد ۱۹۸۵ء میں ''اشراق'' کا احیا بھی ہو گیا۔ ڈیڑھ دو سال یہ ایک مجلّے کی صورت میں شائع ہوتا رہا۔ ۱۹۸۷ء میں مجھے اِس کا ڈیکلریشن مل گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اُس وقت سے اب تک یہ رسالہ بغیر کسی انقطاع کے نکل رہا ہے۔ ''رینی ساں'' ۱۹۹۰ء میں نکلنا شروع ہوا۔ وہ بھی اِسی طرح جاری ہے۔ یہ رسالہ ابتدا ہی سے عزیزم شہزاد سلیم کے سپرد

ہے۔ ''اشراق'' میرے پاس رہا، مگر اِس کو بھی اب میں نے اپنے بیٹے معاذ احسن کے حوالے کر دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ کی مدد شامل حال رہی تو یہ اِسی طرح جاری رہیں گے۔

پچھلے پچیس برسوں میں ''الانصار المسلمون'' اور ''دانش سرا'' کا نظم بھی میرے تعلق سے قائم ہوا اور مولانا وصی مظہر صاحب ندوی اور ڈاکٹر محمد فاروق خان جیسے زعما اِن تنظیموں کے سربراہ رہے، مگر اِن کی عمر چند برسوں سے زیادہ نہیں ہوئی۔ ''المورد''، البتہ گذشتہ ربع صدی سے قائم ہے اور اللہ کی عنایت سے توقع ہے کہ قائم رہے گا۔ ۸۷ء کے بعد ابتلا اور تعطل کا ایک زمانہ اِس پر بھی گزرا ہے، مگر ۱۹۹۱ء میں ہمارے دوست الطاف محمود کی مساعی سے اِس کے احیا کے بعد، اللہ کا شکر ہے کہ اِس کے کاموں میں کبھی کوئی تعطل پیدا نہیں ہوا۔

یہ ادارہ اِس احساس کی بنا پر قائم کیا گیا ہے کہ تفقہ فی الدین کا عمل مسلمانوں کے اندر صحیح نہج پر قائم نہیں رہا۔ فرقہ دارانہ تعصّبات اور سیاست کی حریفانہ کشمکش سے الگ رہ کر خالص قرآن وسنت کی بنیاد پر دین کی دعوت مسلمانوں کے لیے اجنبی ہو چکی ہے۔ قرآن مجید جو اِس دین کی بنیاد ہے، محض حفظ وتلاوت کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ مذہبی مدرسوں میں وہ علوم مقصود بالذات بن چکے ہیں جو زیادہ سے زیادہ قرآن مجید تک پہنچنے کا وسیلہ ہو سکتے تھے۔ حدیث، قرآن وسنت میں اپنی اساسات سے بے تعلق کر دی گئی ہے اور سارا زور کسی خاص مکتب فکر کے اصول وفروع کی تحصیل اور دوسروں کے

مقابلے میں اُن کی برتری ثابت کرنے پر ہے۔

یہ ادارہ اِس صورت حال کی اصلاح کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ چنانچہ اِس کا بنیادی مقصد اسلامی علوم سے متعلق علمی اور تحقیقی کام، تمام ممکن ذرائع سے وسیع پیمانے پر اِس کی نشر واشاعت اور اِس کے مطابق لوگوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ہے۔

اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریق کار اختیار کیا گیا ہے، اُس کے اہم نکات یہ ہیں:

علم وتحقیق

۱۔ دین کے جید علما اور محققین کو ادارے کی فیلوشپ دی جائے۔

۲۔ علمی کام کی صلاحیت رکھنے والے افراد کو ادارے کی طرف سے یا خود اُن کی تجویز پر علمی، تحقیقی، تعلیمی اور دعوتی منصوبے تفویض کیے جائیں اور اِسی بنا پر اُنھیں ادارے سے متعلق کیا جائے۔

۳۔ ادارے میں کام کرنے والے علما اور محققین کو پیش نظر کاموں کے لیے ضروری ماحول، لائبریری اور دوسری سہولتیں فراہم کی جائیں۔

تعلیم وتربیت

۱۔ دینی موضوعات پر سیمینار، ورک شاپ اور مختصر مدت کے کورسوں کا اہتمام کیا جائے۔

۲۔ انٹرنیٹ کے ذریعے سے فاصلاتی کورس (dl courses) کرائے جائیں۔

۳۔ پیش نظر مقاصد کے لیے تربیت گاہیں اور دینی اور دنیوی علوم کی درس گاہیں قائم کی جائیں۔

نشر واشاعت

۱۔ اردو، عربی اور انگریزی زبان میں رسائل جاری کیے جائیں۔

۲۔ انٹرنیٹ پر اِن زبانوں میں ویب سائٹس قائم کی جائیں۔

۳۔ ادارے سے متعلق اہل علم کی تحقیقات، خطبات اور تقاریر وغیرہ کی طباعت اور آڈیو/ویڈیو سی ڈی تیار کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

۴۔ ادارے سے متعلق علما و محققین کے کام کو وسیع پیمانے پر متعارف کرایا جائے۔

۵۔ ادارہ اور اس کے مقاصد کا تعارف لوگوں میں عام کیا جائے۔

''علم وتحقیق'' اور ''نشر واشاعت'' کے زیر عنوان جو کام بیان ہوئے ہیں، وہ بڑی حد تک ہو رہے ہیں۔ ''تعلیم وتربیت'' کے ذیل میں دینی اور دنیوی علوم کی درس گاہیں آیندہ کے منصوبوں میں سرفہرست ہیں۔ میری تمام سعی و جہد کا محور اب یہی ادارہ ہے۔ زندگی کے جتنے دن باقی ہیں، اپنے علمی کاموں کے علاوہ اسی کے لیے خاص کر چکا ہوں۔ اللہ تعالیٰ سے علم وعمل میں اخلاص کی دعا ہے:

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

[۲۰۰۷ء]

میرے بعد

میرا آبائی وطن اگرچہ ضلع سیالکوٹ کا ایک قصبہ داؤد ہے، لیکن میری پیدایش پاک پتن کے قریب ایک گاؤں میں ہوئی اور میں اِسی شہر اور اِس کے سواد میں اُس عمر کو پہنچا جب دماغ کبھی کبھی سوچنا بند کر دیتا اور دل کبھی کبھی دھڑکنا بھول جاتا ہے اور ہم اِس کے نتیجے میں جو کچھ کرتے ہیں، اُس پر آپ ہی حیران ہوتے ہیں:

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

آج سے کم و بیش بیس سال پہلے اِسی شہر کے ایک مدرسے میں، میں چھٹی یا ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ درس نظامی کی کتابیں بھی اُس وقت تک میں نے غالباً ''کافیہ'' اور ''شرح جامی'' تک پڑھ لی تھیں۔ شہرستان علم کے دروا ہو چکے تھے اور میں اب کوچہ و بازار کی سیر دیکھنے کے لیے ہر روز عصر کے بعد شہر کی میونسپل لائبریری جاتا تھا۔ میرا گھر مضافات میں تھا۔ میں وہاں سے چل کر روزانہ پیدل لائبریری پہنچتا۔ شوق طلب بھی کیا چیز ہے۔ میرا یہ معمول برسوں رہا، لیکن مجھے یاد نہیں کہ طبیعت نے کبھی خستگی کی شکایت کی ہو:

طالباں راخستگی در راہ نیست
عشق خود راہ ست وہم خود منزل ست

لائبریری کے راستے میں، میں نے ایک روز دیکھا کہ ایک بنک کے دروازے پر پہرا دینے والے سنتری کی نگاہیں دور تک میرا تعاقب کر رہی ہیں۔ چھوٹی عمر تھی، دل و دماغ اِس صورت حال سے پہلی مرتبہ خوف و حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دوچار ہوئے۔ اگلے کئی روز یہی ہوا تو خوف و حیرت پر تجسس نے غلبہ پالیا۔ میں چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر اِس کی وجہ معلوم کروں، لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ وہ بھی، معلوم ہوتا تھا کہ کچھ کہنا چاہتا ہے، لیکن راہ نہیں پاتا۔ گویا وہی معاملہ تھا جو غالب کے ساتھ بارگاہ عشق میں ہوا تھا:

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گومگو تو کیوں کر ہو

بہت دن گزر گئے۔ ایک شام میں لائبریری سے واپس آ رہا تھا۔ میرے ہاتھ میں خلافت کے موضوع پر ایک علمی کتاب تھی۔ میں راہ چلتے اُس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ مجھے خیال نہیں ہوا کہ بنک قریب آ گیا ہے۔ اچانک میں نے دیکھا، وہ میرا راستہ روکے کھڑا ہے۔ میری نگاہ اُس کے چہرے پر پڑی۔ اُس کی ڈاڑھی سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اُس نے غالباً ابھی وضو کیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور اُس کی پیشانی پر سجدوں کا جمال تھا۔ بڑی محبت کے ساتھ اُس نے مجھ سے

پوچھا: تم یہ کتاب پڑھو گے؟ تم نصاب کی کتابوں کے علاوہ اِس طرح کی علمی کتابیں بھی پڑھتے ہو؟ میں نے اقرار میں سر ہلایا تو اُس نے کہا: تمھارے ہاتھ میں ایک دن میں نے عربی کی ایک کتاب بھی دیکھی تھی۔ تم عربی جانتے ہو؟ جانتا ہوں، میں نے جواب دیا۔ تم نے عربی کہاں پڑھی ہے؟ اُس نے عربی میں مجھ سے سوال کیا تو میں حیران رہ گیا۔ لمحے بھر کے لیے مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں ہوا۔ میں کبھی اُسے دیکھتا اور کبھی اُس کے جسم پر سنتری کی وردی کو دیکھتا۔ میں نے خواص کے لباس میں جاہل دیکھے تھے، یہ میرے لیے پہلا تجربہ تھا کہ میں عوام کے لباس میں ایک عالم کو دیکھ رہا تھا۔

تم جو کتاب لے کر جا رہے ہو، اِسے پڑھ لو۔ یہ ایک بڑے آدمی کی کتاب ہے۔ میں تمھیں ایک اور کتاب دوں گا جس میں اِس کتاب پر علمی تنقید کی گئی ہے۔ تم کوئی رائے قائم کرنے سے پہلے اِسے بھی پڑھ لو۔ علم کی دنیا میں اشخاص کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہاں ساری اہمیت صرف دلیل کو حاصل ہے۔

اِس کے دوسرے دن جو کتاب اُنھوں نے مجھے دی، میں نے اُسی دن اُسے ختم کر لیا۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا جب میں دلیل کی اہمیت سے واقف ہوا۔ میری یہی واقفیت آج بھی میری زندگی کی سب سے بڑی متاع ہے۔ میں نے اِسے ایک سنتری سے حاصل کیا تھا۔ بعد میں، میں نے لاہور کی سب سے بڑی درس گاہ میں فلسفہ اور انگریزی ادب کی تعلیم پائی۔ اِس سے بڑی کوئی چیز، حقیقت یہ ہے کہ میں وہاں سے

بھی حاصل نہ کر سکا۔ میں نے دوران تعلیم میں بارہا سوچا: کاش، میرے سب ہم جماعت اور استاد بھی کبھی لائبریری جاتے ہوئے اِس راستے سے گزرے ہوتے۔

کئی سال بعد، پچھلے ماہ میں پاک پتن گیا۔ ولی محمد صاحب سے اُسی بنک کے دروازے پر ملاقات ہوئی۔ وہ آج بھی وہیں کھڑے تھے جہاں بیس برس پہلے میں نے اُنھیں دیکھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم، اُن کی درس گاہ سے کوئی اور بھی فارغ ہوا یا:

ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

[۱۹۸۶ء]

رفیق صبوحی

بارِ فیقان زخود رفتہ سفر دست نداد
سیرِ صحرائے جنوں حیف کہ تنہا کردم

سرما کی آمد میرے لیے ہمیشہ بڑے اہتزاز کا باعث ہوتی ہے۔ تاروں کے ڈوبنے سے پہلے جب میں گیس کی انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر لپکتے شعلوں کو دیکھتا اور خیال و خامہ کو باہم رشتہ بپا کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو جمعیت خاطر کا جو سامان اُس وقت میسر ہوتا ہے، اُس کے بعد کسی بے سروسامانی کا غم باقی نہیں رہتا:

دل کہ جمع ست، غم از بے سروسامانی نیست
فکر جمعیت اگر نیست، پریشانی نیست

لیکن ۲۷ نومبر کی صبح جب میں نے اِس موسم میں پہلی مرتبہ آتش فسردہ کو شعلہ باری کا اذن دیا تو میں نے دیکھا کہ میرے محسوسات کی دنیا اُس اہتزاز سے بالکل خالی ہے۔ کمرے کی انگیٹھی میں خاموش پڑی آگ تو دیا سلائی کا شعلہ دکھاتے ہی گویا ہو گئی، مگر اِس کے ساتھ لَے لینے کے لیے جو آواز اُس روز دل سے اٹھی، اُسے بس ایک نغمۂ خوں گشتہ ہی کہنا چاہیے:

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟
سوز غم ہائے نہانی اور ہے

ہم جب زندگی کا سفر شروع کرتے ہیں تو اُس میں گاہے کچھ ساتھ چلنے والے بھی میسر آ ہی جاتے ہیں۔ یہ ہم سفر بارہا آپس میں وفا کے عہد باندھتے اور جو کچھ کہتے ہیں، اکثر اُس کو نباہ دینے کے لیے ایک دوسرے سے بڑی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ پھر کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرتا کہ وفا کے عہد ریت کے گھروندوں کی طرح بکھر جاتے اور توقعات کی دنیا صحرائے نجد کی طرح ویران ہو جاتی ہے۔ سفر کی ابتدا میں یہ خیال نہیں ہوتا کہ زندگی کی حقیقتیں اِس قدر تلخ ہوں گی، لیکن اُن کا زہر رگ و پے میں اترتا ہے تو اندر کا انسان باہر آ جاتا اور لوگ ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ اُس وقت کوئی شخص اگر اپنی وفا پر قائم رہے تو اندوہ وفا کے سوا اُس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں

رہتا۔ جانے والے مشتاقانہ اپنی اپنی راہوں پر چلے جاتے ہیں اور وہ حرماں نصیب اپنے عزیز از جان عزیزوں کو خود گاڑی پر بٹھا کر اُسے اسٹیشن پر رینگتے دیکھتا اور پھر تنہا پلیٹ فارم پر کھڑا رہ جاتا ہے:

نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایت زمانہ

اب سے کم وبیش نو برس پہلے نومبر کی اِسی ۲۷ تاریخ کو میں نے اپنے کچھ عزیز از جان عزیزوں کو اِسی طرح رخصت کیا تھا۔ یہ دن ہر سال لوٹ کر آتا رہا، لیکن اِس کی یادوں کا آزار کبھی اِس طرح دل ودماغ پر حاوی نہیں ہوا۔ اب کیا پھر کوئی عزیز از جاں یادرِرکاب ہوگا؟ میں آتش دان کے سامنے بیٹھا رہا اور میری زبان پر بے اختیار وہ شعر جاری ہوگئے جو اب سے نو برس پہلے میں نے اِن جانے والوں کی یاد میں کہے تھے:

مقام شرح جنوں پہ وہی سرور وحضور
نفس نفس وہی تنہا سرود نیم شبی
مری نگاہ سرابوں کی آرزو کا وجود
کہاں سے آئے ندیموں میں ذوق تشنہ لبی

اِسی خطا پہ گریزاں ہیں ہم سفر میرے
کہ میری طبع رواں مصلحت شناس نہیں

وہ ہم سفر کہ زمانے میں جن کی دھوم ہوئی
مثال ماہ تھی تیرہ شبوں میں جن کی جبیں

مرے وجود میں پنہاں وجود کا حاصل
زبان شعر میں اپنے معلقات کہوں
مری نواؤں سے اب وہ بھی آشنا نہ رہے
مرے ندیم، میں شہر جنوں میں تنہا ہوں

مجھے رفیق صبوحی کی جستجو ہی رہی
مرے سبو کی حقیقت تہ سبو ہی رہی

[۱۹۸۸ء]

می باقی

حافظ شیراز نے کہا تھا:

بدہ ساقی می باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلا را

مجھے نہیں معلوم، شیراز کے شاعر کی یہ آرزو بر آئی یا نہیں، لیکن میں نے بارہا دیکھا ہے کہ لاہور کے آب رکنا باد کے کنارے ساقی ہر روز صبوحی لنڈھاتا ہے۔

رکنا باد دیلمی نے جاری کیا تھا اور اُس کے زلال کا ہر جرعہ، حافظ ہی کے کہنے کے مطابق، عمر خضر بخشتا ہے:

ز رکنا باد ما صد لوحش اللہ
کہ عمر خضر می بخشد زلالش

لاہور کی نہر کسی دیلمی نے جاری نہیں کی اور اُس میں زلال بھی نہیں بہتا۔ اُس کے پانی میں مٹی اِس طرح ملی ہوئی ہے، جس طرح سمندر میں شور، لیکن جو منظر اُس کی آہستہ خرامی اور اُس کے کناروں پر دورویہ درخت اور سبزہ زار پیدا کرتے ہیں، اُس کے حسن میں وہ سب کچھ ہے جو نگاہوں میں اِس طرح ٹھیرتا ہے کہ پھر نگاہ روبرو کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ آدمی اِس پر نگاہ غلط انداز بھی ڈالے تو واپس نہیں آتی اور زبان بے اختیار کہتی ہے:

دل کے لیے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں

رکنا باد کا پانی ''درۂ اللہ اکبر'' سے آتا ہے۔ آب خضر کے بارے میں کہتے ہیں کہ اُس کا مقام ظلمات ہے۔ دیکھیے، حافظ نے اِس سے کیا مضمون پیدا کیا ہے:

شیراز و آب رکنی و ایں باد خوش نسیم
عیشش مکن کہ خال رخ ہفت کشور است

فرقست از آب خضر کہ ظلمات جای اوست
تا آب ما کہ منبعش ''اللہ اکبر'' است

اپنے شہر کی اِس نہر کا منبع جاننے کی میں نے کبھی کوشش نہیں کی۔ مجھے اِس کی انتہا معلوم ہے۔ رکنا باد، جیسا کہ حافظ نے کہا، ''درۂ اللہ اکبر'' سے شروع ہوتا ہے۔ یہ میرے لیے ہمیشہ مقام 'اللہ اکبر' پر ختم ہوتی ہے۔ اِسے بے شک، قدرت کے ہاتھوں نے تخلیق نہیں کیا، لیکن شہر کی سنگین عمارتوں کے درمیان یہ ہر صاحب ذوق کے لیے مراقبۂ سحر کا مقام ہے۔ میں نے کئی مرتبہ اُس وقت جب پو پھوٹتی اور فضا میں کچھ کچھ روشنی پھیل جاتی ہے، اِسے زمین کی پستیوں سے آسمان کی بلندیوں تک پہنچتے دیکھا ہے۔

اِس زمانے کے شہروں میں رہنے والے، جن کے لیے دن نیمۂ شب کے بعد ختم ہوتا اور صبح نیمۂ روز سے کچھ پہلے طلوع ہوتی ہے، اِسے سمجھ نہ سکیں گے۔ وہ اگر کبھی ڈوبتے تاروں کی چھاؤں میں اِس کے کنارے کھڑے ہو کر صبح کو طلوع ہوتے دیکھیں تو اُنھیں معلوم ہو کہ یہ محض آب جو نہیں، اِس عالم کے بنانے والے تک پہنچنے کا راستہ بھی ہے۔

نئے تمدن نے ہمیں صرف اُس قرآن سے بے تعلق نہیں کیا جس میں حقائق لفظوں کے لباس میں جلوہ گر ہوئے ہیں، اُس قرآن سے بھی محروم کر دیا ہے جس کی آیتیں صحیفۂ فطرت میں لکھی گئیں اور جسے انسان کبھی شب و روز پڑھتا تھا۔ اب وہ پہر دن چڑھے اٹھتا، برگ سیاہ کا پانی اپنے رگ و پے میں اتارتا اور سب سے پہلے اخبار پڑھتا

ہے جس میں اُس کے لیے سب خبریں ہوتی ہیں، اُس کی اپنی کوئی خبر نہیں ہوتی۔

اِن روز وشب میں، اُسے کیا معلوم کہ وہ صبوحی کیا ہے جو لاہور کے اِس آب رکنا باد کے کنارے لنڈھائی جاتی ہے؟

دیکھیے، کیا شعر یاد آیا۔ کسی نے شاید، اِسی طرح کے کسی مقام پر صبح کو اترتے دیکھ کر کہا تھا:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

[۱۹۸۶ء]

دبستان شبلی

حلقہ گرد من زنید اے پیکران آب وگل
آتشے در سینہ دارم از نیاگان شما

رات کے پچھلے پہر اپنی مطالعہ کی میز پر بیٹھا ہوں۔ آلہ تکییف نے کمرے کی ساری گرمی باہر پھینک دی ہے، لیکن سینے کی آتش پر اُس کا زور کیا چلتا، اُس کی انگیٹھی برسوں سے سلگ رہی ہے۔ میں نے بارہا چاہا کہ اُس کی کچھ چنگاریاں ادھر ادھر بجھی

ہوئی راکھ میں بھی ڈال دوں تو شاید قرار آ جائے، لیکن اِس سے تپ شعلہ کیا کم ہو جائے گی؟

غزلے زدم کہ شاید بنوا قرارم آید
تپ شعلہ کم نہ گردد زگستن شرارہ

تاہم آج یہ چنگاریاں خود بے تاب ہیں کہ اِس آگ کا پتا دوسروں کو بھی دیں:

می کشد شعلہ سرے از دل صد پارۂ ما
جوش آتش بود امروز بہ فوارۂ ما

۱۸۵۷ء جہاں ہماری تاریخ کا وہ سال ہے جس میں ہمارے اقبال کا آفتاب برصغیر میں غروب ہوا، وہاں ایک دوسرا آفتاب اِس سال میں مطلع امت پر طلوع بھی ہوا۔ یہ مولانا شبلی کا سال پیدایش ہے۔ سید سلیمان ندوی کے بقول: وہ ہنگامۂ مشرق میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۴ء کے ہنگامۂ مغرب میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ اُنھی کا دور ہے جس میں مغربی تہذیب سے ہمارا پہلا تعارف ہوا اور اِس کے نتیجے میں یہ امت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ اِن میں سے ایک گروہ اِس بات پر مصر ہوا کہ نہ دین کو خاص اپنے مکتب فکر کے اصول ومبادی اور اپنے اکابر کی رایوں سے بالاتر ہو کر براہ راست قرآن وسنت سے سمجھنا ممکن ہے اور نہ مغربی تہذیب اور اُس کے علوم اِس کے مستحق ہیں کہ وہ کسی پہلو سے اہل دین کی نظروں میں ٹھیریں۔ اِس گروہ کے بڑوں میں قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، محمود الحسن دیو بندی، انور شاہ کاشمیری، حسین احمد مدنی،

اشرف علی تھانوی اور شبیر احمد عثمانی کے نام بہت نمایاں ہیں۔ دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا جن کے نزدیک حق و باطل کا معیار یہی تہذیب اور اُس کے علوم قرار پائے۔ اُن کا سرخیل وہی بڈھا تھا جس کے بارے میں خود شبلی نے کہا تھا:

پیری سے کمر میں اک ذرا خم
توقیر کی صورت مجسم

شبلی اِن دونوں کے مقابلے میں ایک تیسری جماعت کے بانی ہوئے۔ اِس جماعت کے بنیادی اصول دو تھے: ایک یہ کہ ہمارے لیے ترقی یہی ہے کہ ہم پیچھے ہٹتے چلے جائیں، یہاں تک کہ اُس دور میں پہنچ جائیں جب قرآن اتر رہا تھا اور جب خدا کا آخری پیغمبر خود انسانوں سے مخاطب تھا۔ اور دوسرے یہ کہ یہ خود قدیم کی ضرورت ہے کہ ہم جدید سے بھی اُسی طرح آشنا رہیں، جس طرح قدیم سے ہماری شناسائی ہے۔ سید سلیمان ندوی، ابوالکلام آزاد، ابوالاعلیٰ مودودی، حمید الدین فراہی، امین احسن اصلاحی، یہ سب اِسی جماعت کے اکابر ہیں۔ میں اِسے ''دبستانِ شبلی'' کہتا ہوں۔ اقبال بھی زیادہ تر اِسی دبستان سے متعلق رہے۔ اُن کی آواز اِس عہد کی خوب صورت ترین آواز تھی۔ اُن کی شاعری ادب عالیہ قرار پائی۔ تاہم فلسفہ و تصوف سے دل چسپی کی وجہ سے اُن کا معاملہ وہی رہا جو اِس سے پہلے ہم اپنی تاریخ میں، مثلاً غزالی کے ہاں دیکھ چکے تھے۔ وہ جس غزال رعنا کے اسیر ہوئے، اُس پر چلانے کے لیے تیر کمان میں رکھتے ہیں، پھر اُسے دیکھتے ہیں تو یہی تیر کسی اور کے سینے

میں ترازو ہو جاتا ہے۔ گویا وہی معاملہ ہے:

خدنگ جعبۂ توفیق امشب در کمانم بود
غزالم در نظر بسیار خوب آمد خطا کردم

سید سلیمان ندوی اگرچہ شبلی کے جانشین ہوئے، لیکن حق یہ ہے کہ وہ پہلے گروہ ہی سے متعلق تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے عملاً اِس حقیقت کو اِس طرح ثابت کیا کہ مولانا اشرف علی تھانوی کی بیعت کر لی۔ عبدالماجد دریابادی کے بارے میں بھی خیال ہوتا ہے کہ شاید اِسی جماعت کے فرد تھے، لیکن اُن کی داستان حیات یہی ہے کہ دانش گاہ الحاد سے نکلے اور سیدھے تھانہ بھون کی خانقاہ میں پہنچ گئے۔ ابوالکلام اِس دور کے عبقری تھے، اُن کی تحریر و خطابت نے ایک زمانے کو متاثر کیا۔ وہ آئے تو لگتا تھا کہ صحراؤں کی وسعتیں سمٹ گئیں اور دریاؤں کا زور اُن کے سامنے ٹوٹ گیا ہے، لیکن اُن کے علم و عمل کی ناقہ خود اپنے ہی غبار میں گم ہو گئی۔ ابوالاعلیٰ عالم بھی تھے اور صاحب طرز انشا پرداز بھی۔ اُن کے حسن طبیعت میں حسن فطرت کی جھلک تھی۔ وہ اُن کے بعد اِس شان سے اِس راہ پر چلے کہ ہر شخص نے یہی خیال کیا کہ اب منزل پر پہنچ کر ہی دم لیں گے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت آگے گئے، لیکن پھر بھی کتنا پیچھے رہ گئے، اِس کا اندازہ کوئی شخص اگر کرنا چاہے تو مثال کے طور پر قرآن مجید کی آیت 'فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا' کے بارے میں فراہی کی تحقیق اور اُن کی تفسیر کو ایک نظر دیکھ لے۔ میں نے آخری عمر میں اُنھیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ پاس ادب مانع رہا، ورنہ بارہا جی چاہا کہ اُن کی

خدمت میں عرض کروں:

بال بکشا و صفیر از شجر طوبیٰ زن
حیف باشد چو تو مرغے کہ اسیر قفسی

اِس دبستان میں جس شخص کو امام العصر کہنا چاہیے، وہ تنہا حمید الدین فراہی ہیں۔ وہ اِس زمین پر خدا کی آیات میں سے ایک آیت تھے۔ سید سلیمان ندوی سے سنیے، وہ اُن کی وفات پر لکھتے ہیں:

''الصلوٰۃ علیٰ ترجمان القرآن (مفسر قرآن کی نماز جنازہ) وہ صدا ہے جو آج سے ساڑھے چھ سو برس پیشتر مصر و شام سے چین کی دیواروں تک ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی نماز جنازہ کے لیے بلند ہوئی تھی۔ حق یہ ہے کہ یہ صدا آج پھر بلند ہو اور کم از کم ہندوستان سے مصر و شام تک پھیل جائے کہ اِس عہد کا ابن تیمیہ ۱۱ نومبر ۱۹۳۰ء (۱۹ جمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ) کو اِس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ جس کے فضل و کمال کی مثال آیندہ بظاہر حال عالم اسلامی میں پیدا ہونے کی توقع نہیں۔ جس کی مشرقی و مغربی جامعیت عہد حاضر کا معجزہ تھی۔ عربی کا فاضل یگانہ اور انگریزی کا گریجویٹ، زہد و ورع کی تصویر، فضل و کمال کا مجسمہ، فارسی کا بلبل شیراز، عربی کا سوق عکاظ، ایک شخصیت مفرد، لیکن ایک جہان دانش۔ ایک دنیاے معرفت، ایک کائنات علم، ایک گوشہ نشین مجمع کمال، ایک بے نوا سلطان ہنر، علوم ادبیہ کا یگانہ، علوم عربیہ کا خزانہ، علوم عقلیہ کا ناقد، علوم دینیہ کا ماہر، علوم القرآن کا واقف اسرار، قرآن پاک کا دانائے رموز، دنیا کی دولت سے بے نیاز، اہل دنیا

سے مستغنی، انسانوں کے ردوقبول اور عالم کی داد وتحسین سے بے پروا، گوشۂ علم کا معتکف اور اپنی دنیا کا آپ بادشاہ۔ وہ ہستی جو تیس برس کامل قرآن پاک اور صرف قرآن پاک کے فہم وتدبر اور درس وتعلیم میں محو، ہر شے سے بےگانہ اور شغل سے ناآشنا تھی۔ افسوس کہ اُن کا علم اُن کے سینہ سے سفینہ میں بہت کم منتقل ہوسکا۔ مسودات کا دفتر چھوڑا ہے، مگر افسوس کہ اُس کے چھپنے اور ربط ونظام دینے کا دماغ اب کہاں۔ جو چند رسالے چھپے، وہ عربی میں ہیں، جن کے عوام کیا، علما تک ناقدر شناس ہیں۔ اُن کی زندگی ہمارے لیے سرمایۂ اعتماد تھی اور اُن کا وجود دارالمصنفین کے لیے سہارا تھا۔ افسوس کہ یہ اعتماد اور سہارا جاتا رہا اور صرف اُسی کا اعتماد اور سہارا رہ گیا جس کے سوا کسی کا اعتماد اور سہارا نہیں۔ اِس سے زیادہ افسوس یہ ہے کہ یہ ہستی آئی اور چلی گئی، لیکن دنیا اُن کی قدر ومنزلت کو نہ پہچان سکی اور اُن کے فضل وکمال کی معرفت سے ناآشنا رہی:

تو نظیری زفلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی وکس قدر تو نشناخت دریغ''

یہ شرف تنہا اِسی ہستی کو حاصل ہوا کہ اِس نے سفر شروع کیا تو پھر راہ نہیں چھوڑی۔ چنانچہ اِس راہ کے مسافروں میں منزل بھی تنہا اِسے ہی ملی۔ امین احسن اصلاحی اِسی نابغۂ عصر کے جانشین ہیں۔ وہ اپنے استاد سے آگے نہیں بڑھے تو پیچھے بھی نہیں رہے۔ حمیدالدین جس مقام پر پہنچے تھے، اُن کی ساری عمر اُسی کے اسرار ورموز کی وضاحت میں گزری ہے۔ اُن کی ''تدبر قرآن'' تفسیر کی کتابوں میں ایک بےمثال شہ پارۂ علم و

تحقیق ہے۔ اُن کے قلم سے پچاس برس کے معرکوں کی روداد سنیے تو بقول عرفی:

رمح او گوید اگر جنگ و گر صلح کہ من
بہ کشاد گرہ جبہۂ خاقاں رفتم

وہ عمر بھر جن لوگوں میں رہے، اُن میں کم ہی اِس کے اہل تھے کہ اُن کے فضل و کمال کو پہچانتے۔ میں نے اُن کی مجلس میں صدیوں کے عقدے لمحوں میں کھلتے دیکھے اور بارہا اعتراف کیا ہے کہ:

طے می شود ایں رہ بدرخشیدن برقے
ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم

اب اِس وقت دیکھیے، پہلے گروہ کی عمر پوری ہو چکی۔ اِس کی مثال اب اُس فرسودہ عمارت کی ہے جو نئی تعمیر کے وقت آپ سے آپ ویران ہو جائے گی۔ دوسرا گروہ، اگرچہ ابھی شرف و اقتدار کے ایوانوں پر قبضہ کیے ہوئے ہے، لیکن تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ پرانی ضلالتوں کی طرح یہ ضلالت بھی کچھ عرصے کے بعد اُس کے صفحات ہی میں باقی رہ جائے گی۔ آنے والے دور کی امامت ''دبستان شبلی'' کے لیے مقدر ہے۔ تاریخ کے مرسح پر اب پس پردہ اِسی کے ظہور کی تیاری ہو رہی ہے۔

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اُس کی سحر بے حجاب

لیکن یہ خود کس حال میں ہے؟

سید سلیمان ندوی کے خلف ابوالحسن علی ہیں، مگر وہ اُنھی کی طرح اب ندوہ سے زیادہ دیوبند میں ہیں۔ ابوالکلام اِس دنیا سے تنہا رخصت ہوئے۔ ابوالاعلیٰ نے جو لوگ اپنے پیچھے چھوڑے، اُن میں وہ بھی ہیں جو اُن کے جانشین ہوئے اور وہ بھی جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اُنھی کی جانشینی میں لوگوں سے سمع وطاعت کی بیعت لے رہے ہیں۔ ابوالاعلیٰ کی میراث میں سے بہت سی چیزیں اُن دونوں کو ملیں، مگر اُن کے علم وادب اور حسن طبیعت سے کوئی حصہ، افسوس ہے کہ اُنھیں نہیں مل سکا۔ چنانچہ اِن بے چاروں کے لیے اِس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہ اِسی پہلے گروہ کے دروازے پر ہاتھ پھیلائیں اور بار بار دھتکارے جائیں، یہاں تک کہ ''دبستان شبلی'' کی ہر 'غلطی' کا کفارہ بھر دیں۔ اِس جماعت میں، بے شک اِن کے علاوہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جن کے بارے میں کوئی شخص اگر چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ وہ کچھ پڑھے لکھے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ اُن کی حیثیت بھی اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ابوالاعلیٰ ہی کے متن کی شرح ہیں۔ عرفی نے صدیوں پہلے شاید اِنھی کے لیے کہا تھا:

قدم بروں منہ از جہل یا فلاطوں شو

کہ درمیانہ گزینی سراب وتشنہ لبی ست

''دبستان شبلی'' کی آخری نشانی اب امین احسن ہی ہیں۔ اُن کے تلامذہ واحباب

میں کتنے ہیں جو اِس حقیقت سے آگاہ ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے دس برس سے اِسی احساس کی آگ ہے جو میرے سینے میں سلگ رہی ہے۔ اِس کی چنگاریاں اپنی ہی راکھ میں دب جاتی ہیں، مگر بجھنے نہیں پاتیں:

کہ آتشے کہ نہ میرد ہمیشہ در دل ماست

کبھی جی چاہتا ہے کہ ابوالاعلیٰ کے جانشینوں سے کہوں:

دست ہر نااہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

کبھی خیال آتا ہے کہ امین احسن کے حلقۂ سخن سے عرض کروں:

آں نیست کہ من ہم نفساں را بگذارم
با آبلہ پایاں چہ کنم قافلہ تیز است

دیکھیے، قلم کی سیاہی خشک ہوگئی۔ یہ حادثہ میرے ساتھ پہلی بار نہیں ہوا۔ میں نے جب بھی یہ داستان سنانی شروع کی، یہیں پہنچ کر ختم ہوگئی۔ کبھی لفظ جواب دے گئے، کبھی رشتۂ معنی میں گانٹھ پڑ گئی، کبھی سننے والے سو گئے، اور آج ـــــ قلم ایں جا رسید سر بشکست۔ یہ شاید، میرے لیے اِس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ:

سخن از تاب و تب شعلہ بہ خس نتواں گفت

[۱۹۸۷ء]

شعلہ ونشیمن

پچھلے چند مہینوں میں مجھے دو مرتبہ اپنا مکان بدلنا پڑا۔ نیو گارڈن ٹاؤن سے اٹھے ہوئے ابھی بہ مشکل پندرہ بیس ہفتے ہوئے تھے کہ اقبال ٹاؤن میں نئے گھر کے مالک نے اُسے بیچنے کا فیصلہ کرلیا۔ گویا وہی معاملہ ہوا کہ:

آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

میں نے اِس مکان کی تلاش اور اِسے رہنے کے قابل بنانے میں بڑی محنت اٹھائی تھی۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ مجھے اتنی جلدی یہاں سے اٹھنا پڑے گا۔ گھر کے مالک کو بھی اِس کا احساس تھا۔ اُس نے بڑی ندامت کے ساتھ اپنی مجبوری کا ذکر کیا۔ میں انکار کر دیتا تو وہ یقیناً خاموش ہو جاتا۔ مجھے خیال ہوا، شعلہ ونشیمن کو جمع کرنے میں جو مزہ ہے، وہ اُس عافیت میں ہرگز نہ ہوگا جو انکار کی صورت میں مجھے یہاں میسر رہے گی۔ میں نے گھر خالی کر دینے کا وعدہ کرلیا:

از بہر آشیانہ خس اندوزیم نگر
باز ایں نگر کہ شعلۂ در گیرم آرزوست

پچھلے پندرہ برسوں میں، میں نے کئی مکان بدلے ہیں۔ دوسرے کا گھر ایک دن

آدمی کو خالی کرنا ہی پڑتا ہے۔ مجھے جب کبھی گھر کا مالک اپنا گھر چھوڑنے کے لیے کہتا ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ ایک بڑی حقیقت کی یاددہانی ہے۔ اِس دنیا میں ہم جس کے گھر میں رہ رہے ہیں، وہ بھی ایک دن یقیناً اِسے چھوڑنے کے لیے کہے گا۔ ہم اِس مالک سے تکرار کر سکتے ہیں، اُس کے سامنے اِس کا بھی امکان نہیں۔ یہاں ہم اپنا سب ساز و برگ ساتھ لے جا سکتے ہیں، وہاں یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ ہم مجبور ہیں کہ ایک دن اُس کا گھر خالی کر دیں اور ہم نے اُسے جس طرح استعمال کیا ہے، اُس کے لیے اُس کے سامنے مسئول ٹھیرائے جائیں۔ یہ اِس عالم کی سب سے بڑی حقیقت ہے جس سے کسی کے لیے مفر نہیں۔ یہاں ہر حادثہ دراصل اِسی حقیقت کی یاددہانی ہے:

اہل بینش کو ہے طوفان حوادث، مکتب
لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں

[۱۹۸۶ء]

چراغ آرزو

میں جب سے ماڈل ٹاؤن منتقل ہوا ہوں، فجر کی نماز قرآن اکیڈیمی کی مسجد میں پڑھتا ہوں۔ ای بلاک کی مسجد اگرچہ میرے گھر کے بالکل قریب ہے، لیکن اکیڈیمی کی جامع مسجد

کے قاری جس طرح صبح کی دل آویزی میں نوائے جبریل کی آمیزش کرتے ہیں، اُس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں کبھی اِس 'مِزَاجُهَا كَافُوْرًا' سے لذت اٹھانے کا موقع ملا ہے۔ مے خانۂ فطرت سے جو صبوحی لنڈھائی جاتی ہے، میں اُس کے لیے اِس سے وہی کام لیتا ہوں جو میرزا غالب نے گلاب سے لیا تھا:

آسودہ باد خاطر غالب کہ خوئے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

صبح کی نماز میں یہاں ایک دوسری 'آمیزش' بھی وجود میں آتی ہے۔ اِس اکیڈیمی کے سربراہ ڈاکٹر اسرار احمد ہیں۔ وہ موجود ہی ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے مقامی سربراہ ملک محمد اسلم اور ''قومی ڈائجسٹ'' کے مدیر مجیب الرحمٰن شامی بھی یہیں نماز پڑھتے ہیں۔ ہم سب لوگ بالعموم ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر صبح قربت و دوری کا وہی منظر پیدا ہو جاتا ہے جس کے بارے میں کلیم نے کہا تھا:

با من آمیزش او الفت موج ست و کنار
روز و شب با من و پیوستہ گریزاں از من

نماز کے بعد ایک روز غالباً اِسی صورت حال سے متاثر ہو کر ملک اسلم صاحب نے مجھ سے کہا: تم آج صبح کی چائے میرے ساتھ پیو گے۔ ملک صاحب کا گھر قریب ہی ہے۔ ہمیں وہاں تک پہنچنے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ ڈرائینگ روم میں بیٹھتے ہی اُنھوں نے فرمایا: تم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ اہل دین ایک جگہ جمع کیوں نہیں رہ

سکے؟ اِس دین میں کوئی خامی ہے یا ہمارا مرض لاعلاج ہو گیا؟ ہم خیر غالب پر نگاہ کیوں نہ رکھ سکے؟ ہماری نگاہ میلی کیوں ہوگئی؟ دنیا میں دوسرے نقطہ ہائے نظر کے علم بردار بھی ہیں، اُن میں یہ دوری کیوں نہیں؟ غلبۂ دین کا خواب اِس ملک میں کبھی شرمندۂ تعبیر بھی ہوگا؟ مجھے تو اب کہیں روشنی نظر نہیں آتی۔ یاس کی تیرگی کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔

ملک صاحب اِس راہ کے پرانے مسافر ہیں۔ اُن کے تاثر سے اختلاف کی گنجایش نہ تھی۔ میں نے سوچا کہ اُن کی خدمت میں کچھ عرض کروں، لیکن محسوس ہوا کہ اِس کے لیے بھی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ میں اپنی امید کا چراغ تہ دامن کر سکتا ہوں، اُنھیں چراغ دکھا نہیں سکتا۔ وہ اب وہاں پہنچ چکے ہیں جہاں آدمی دل کے طاق کو خالی دیکھتا اور اپنے مخاطب کو بس یہ بتانا چاہتا ہے کہ:

اِسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں

[۱۹۸۷ء]

معجزۂ فن

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

میں جس محلّہ میں رہتا ہوں، اُس کی جامع مسجد کی پیش گاہ پچھلے کئی مہینوں سے زیرِ تعمیر ہے۔ پہلے برآمدے میں بس کچھ سادہ در بنے ہوئے تھے جن سے گزر کر مسجد کے دالان میں داخل ہوتے تھے۔ اب اُنھیں محرابوں میں بدل کر سامنے کنگنی اور تاج بنانے کا فیصلہ ہوا تو تین چار ماہ پہلے تعمیر شروع کر دی گئی۔ میں نے دیکھا کہ برآمدے کی دیوار دنوں میں منہدم ہوئی اور ہفتے عشرے ہی میں نئی تعمیر نیو سے چھت تک کھڑی ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ اب مسجد کا صحن غالباً دو تین ہفتوں میں اینٹ گارے سے خالی ہو جائے گا، لیکن جب معاملہ تاج کی برجیوں اور مناروں تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ وقت کی رفتار تھم گئی اور معماروں کے ہاتھ کام سے رک گئے ہیں۔ پہلے بنا پڑتی نہ تھی کہ دیوار بام تک پہنچ جاتی تھی، اب ایک ایک برجی کے کلس اور کنگروں کی تعمیر میں مہینے گزرتے ہیں۔ یہ میرے محلے کی چھوٹی سی مسجد ہے۔ معلوم نہیں، مسجد عالمگیری، قلعۂ معلّٰی اور تاج محل کی محرابوں اور برجیوں پر اُن کے معماروں نے کتنی مرتبہ آفتاب صبح کو افق پر تیرہ ہوتے دیکھا ہوگا۔ کوئی معمار لب لعلیں تراشنے کے لیے بیٹھ جائے تو جب تک دن مہینوں میں نہ بدلیں، کنج دہن بھی نمایاں نہیں ہوتا:

سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

ہر تخلیق اِسی طرح مرتبۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ شعر وہ بھی ہوتے ہیں کہ ردیف و قافیہ میسر ہوتے رہے تو ہر دوسرے مہینے ایک دیوان کی ترتیب سے فارغ ہو گئے، اور وہ

بھی جن کے بارے میں کہا گیا کہ:

برائے پاکی لفظے شبے بروز آرد
کہ مرغ و ماہی باشند خفتہ او بیدار

پہلی صورت میں اینٹ مسالا کم نہ پڑے تو نتیجہ دنوں میں سامنے آ جاتا ہے۔ دوسری صورت میں نتیجہ اینٹ مسالے سے نہیں، خون جگر سے پیدا ہوتا ہے:

رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خون جگر سے نمود

یہ حادثہ اِس زمانے میں پہلی بار نہیں ہوا کہ لوگ اِن دونوں کے نتائج میں فرق کرنے سے قاصر رہے۔ بنی آدم کی تاریخ بیش تر اِنھی حوادث کا دفتر ہے۔ اِس دنیا میں، اِس سے پہلے بھی بارہا یہ ہو چکا کہ لوگوں نے جعفر زٹلی اور غالب کا مرتبہ اُن کے دیوان میں شعر گن کر طے کرنے کی کوشش کی اور یوحنا و مسیح کے زمانے میں اُن کا مقام اُن کے معتقدین کی تعداد سے متعین کرنا چاہا۔ اِس طرح کے لوگوں سے کون کہے کہ:

نگاہ تیری فرومایہ، ہاتھ ہے کوتاہ
ترا گنہ کہ نخیل بلند کا ہے گناہ

[۱۹۸۹ء]

تہذیب کی جنگ

دین کی حقیقت پر غور کیجیے، یہ دو چیزوں کا مجموعہ ہے: ایک قانون، دوسرے حکمت۔ اِس کی یہ تالیف لازمی طور پر تقاضا کرتی ہے کہ ہماری حیات اجتماعی میں یہ صرف نظریہ وعمل ہی کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک تہذیب کی حیثیت سے نمایاں ہو۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ اپنی تاریخ کے اِس دور جدید میں یہ ام القریٰ سے نکل کر جب مدینہ میں اپنی پہلی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہوا تو اِس کے صدی، نصف صدی بعد ہی اِس کے اثرات مسلمانوں کے پورے تمدن پر نمایاں ہونا شروع ہو گئے۔ لوگوں کا لباس، اُن کی طرز معاشرت، اُن کی ثقافت، اُن کی تقریبات، اُن کی عمارتیں، اُن کے معبد، اُن کے شہر، اُن کے قصبے، اُن کے پیشے اور اُن کے رہن سہن کے طریقے، یہ سب چیزیں اُس کے غلبہ کے بعد بتدریج جن سانچوں میں ڈھلتی چلی گئیں، وہ یقیناً اُن سانچوں سے بہت کچھ مختلف تھے جن میں لوگ اِس سے پہلے اُنھیں دیکھتے رہے تھے۔ یہ تو بے شک ہوا کہ عرب وعجم میں ہر جگہ اِس تبدیلی کی صورتیں ایک دوسرے سے مختلف رہیں اور ہر قوم نے اپنی انفرادی شخصیت کے بطن ہی سے اِس تبدیلی کو جنم دیا، لیکن مغرب اقصیٰ سے مشرق اقصیٰ تک سب قوموں میں دیکھ لیجیے، اِس

کی صورتوں کا تنوع اُن خصائص سے کہیں محروم نہیں رہا جن کی بنیاد پر ہم اُنھیں تمدن کی اسلامی صورتیں قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ خصائص اُن کے لباس میں، اُن کی طرزِ تعمیر میں، اُن کی معاشرت میں، اُن کی نشست و برخاست میں، اُن کے شہروں، اُن کے قصبوں، اُن کے گھروں، یہاں تک کہ اُن کے غسل خانوں اور باورچی خانوں کی تعمیر و تزیین میں بھی اِس طرح نمایاں ہوئے کہ اِن سب چیزوں کی وضع قطع اُن کے پرانے سانچوں سے کچھ کم ہی مماثل رہ گئی۔

تمدن کے یہی مظاہر ہیں جنھیں ہم اپنی تہذیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ تہذیب اگرچہ پچھلے تین سو سال سے روبہ زوال ہے، اِس کا فطری ارتقا بند ہو چکا ہے، اِس پر مسلمانوں کی اسلام سے عملی بے پروائی کے اثرات بھی نمایاں ہیں، امتداد زمانہ سے جاہلیت کے بہت سے اجزا بھی اِس میں شامل ہو چکے ہیں اور یہ بلاشبہ بہت کچھ اصلاح کی متقاضی ہے، لیکن اِس سب کچھ کے باوجود یہ بہرحال میری تہذیب ہے۔ میں اِس میں ہر وقت اصلاح کے لیے تیار ہوں، لیکن اِس کو چھوڑ کر میں مغربی تہذیب کو اختیار کر لوں، یہ میرے لیے کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مغربی تہذیب اِس وقت دنیا کی غالب تہذیب ہے اور میری قوم کے کارفرما عناصر اُس سے اِس قدر مرعوب ہو چکے ہیں کہ اُن کی ساری جدوجہد اب اُس کو پوری طرح اپنا لینے ہی میں لگی ہوئی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اُنھیں یہ بات اب بہت آسانی کے ساتھ نہیں سمجھائی جا سکتی کہ دین اگر اپنی تہذیبی شناخت سے محروم ہو جائے تو اُس کی حیثیت پھر اُس

آفتاب کی سی ہوتی ہے جو آسمان پر نمودار تو ہوا، لیکن گہرے بادلوں کے پیچھے سے اپنی شعاعیں ہماری زمین تک پہنچانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔

میں اِس صورت حال سے واقف ہوں اور مجھے اِس پر کچھ تعجب نہیں ہوتا، لیکن میں جب یہ دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ جو اسلامی دعوت کے علم بردار ہیں، وہ بھی تہذیب مغرب کے خلاف حلت وحرمت کی فقہی اصطلاحوں سے آگے بڑھ کر اِس طرح کی کوئی تنقید سننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اِس تہذیب کا مزاج اور اِس کی طبیعت ہی اُس تہذیبی رویے سے بالکل مختلف ہے جو اسلام اپنے ماننے والوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ دل بیٹھ جاتا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ اسلام کا کوئی لباس نہیں، لیکن مجھے اصرار ہے کہ اسلامی لباس صرف وہی ہے جس کا ارتقا اسلام کی آغوش میں ہوا ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اسلام کا کوئی فن تعمیر نہیں، لیکن مجھے اصرار ہے کہ وہ فن تعمیر جو اسلام کے بطن سے تولد نہیں ہوا، وہ میرے لیے وہ ماحول اور وہ فضا کبھی میسر نہیں کر سکتا جس میں اسلام کی خوش بو میرے گردوپیش میں پھیلی ہوئی محسوس ہو۔ مجھے اِس بات سے انکار نہیں ہے کہ اسلام کسی خاص سائنس اور ٹیکنالوجی کو لے کر اِس دنیا میں نہیں آیا، لیکن مجھے اصرار ہے کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی جو اسلام کے معمل میں پیدا ہوسکتی تھی، وہ اُس سے بالکل مختلف ہوتی جو اِس وقت تہذیب مغرب کی لیبارٹری میں جنم لے چکی، بلکہ پروان چڑھ کر اب اپنے عروج کے نتائج دیکھ رہی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اسلام نے گھروں اور شہروں

اور اُن میں رہن سہن کا کوئی خاص نقشہ بنا کر ہمیں نہیں دیا ہے، لیکن مجھے اصرار ہے کہ وہ گھر اور وہ شہر جو اسلام کی فضا میں تعمیر ہوتے ہیں، اور وہ رہن سہن جو اسلام کے معاشرتی تصورات کے زیر اثر وجود میں آتا ہے، اُس کی صورت یقیناً وہ نہیں ہوسکتی جو میں اب جدہ، ریاض، قاہرہ، تہران، کوالالمپور، لاہور، کراچی اور اسلام آباد میں پیدا ہوتے دیکھ رہا ہوں۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ اسلام نے کوئی کھیل ایجاد نہیں کیے، لیکن مجھے اصرار ہے کہ اُس کی تہذیبی اقدار کے سانچے میں ڈھل کر جو کھیل بھی پیدا ہوتے، وہ اِس زمانے کے بعض کھیلوں کی طرح نہیں ہوسکتے تھے۔

مجھے اِن سب باتوں پر اصرار ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام کی جنگ اگر تہذیب کے میدان میں ہار دی گئی تو پھر اُسے عقائد و نظریات کے میدان میں جیتنا بھی بہت مشکل ہو جائے گا۔ اِس وجہ سے میں اپنے اُن دوستوں کی خدمت میں جو اردو اور شلوار قمیص اور اِس طرح کی دوسری چیزوں پر میرے اصرار کو دیکھ کر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، بڑے ادب کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں صرف فکر مغرب ہی کو نہیں، اُس کی تہذیب کو بھی اپنے وجود کے لیے زہر ہلاہل سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں جس طرح اُس کے فکری غلبہ کے خلاف نبرد آزما ہوں، اِسی طرح اُس کے تہذیبی استیلا سے بھی برسر جنگ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اِس معرکہ میں فتح کس کی ہوگی، لیکن یہ میرے ایمان کا تقاضا ہے کہ میں پوری قوت کے ساتھ اُس سے لڑتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ میں نے جب اپنے زمانۂ طالب علمی میں پہلی

مرتبہ ''ضرب کلیم'' کی لوح پر یہ جملہ لکھا ہوا دیکھا کہ: ''اعلان جنگ دور حاضر کے خلاف'' ـــــ تو حقیقت یہ ہے کہ اِس کی معنویت مجھ پر واضح نہیں ہوئی، لیکن اب میں جانتا ہوں کہ دور حاضر سے یہاں اقبال کی مراد کیا ہے، اور اُس نے یہ کیوں ضروری سمجھا کہ وہ اِس زمانے کے چند باطل نظریات ہی کے خلاف نہیں، بلکہ پورے دور حاضر کے خلاف اعلان جنگ کر دے۔ میں اپنے دوستوں کی خدمت میں بھی یہی عرض کروں گا کہ ہو سکے تو وہ بھی خلوت میں کبھی ''ضرب کلیم'' پڑھیں۔ اِس لیے کہ:

فغان نیم شبی بے نوائے راز نہیں

[۱۹۸۹ء]

قمار عشق

فلک مقام پہاڑوں میں ہر طرف پتھر
سپید و سرخ، مثال وجود گوناگوں
یہ سب جمود و صلابت میں مثل چرخ بریں
نہ اِن میں گرم نگاہی، نہ اِن میں سوز دروں

اِسی زمین پہ کھوئے ہوئے زمانوں میں
کیا ہے چشم فلک نے عجیب نظارہ
شہید جلوۂ یزداں ہوا کوئی پتھر
کسی کے جسم سے پھوٹا ہوا ہے فوارہ

میں اپنی قوم سے پوچھوں کہ تیرے پہلو میں
یہ ایک دل ہے کہ نرم و گداز مثل حریر
میں پوچھتا ہوں کہ میری ہزار سالہ نوا
یہ کیا کہ اِس پہ ہمیشہ رہی ہے بے تاثیر!

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوے آب کرے
غیاب قدرت یزداں کو بے حجاب کرے

اب سے غالباً بیس برس پہلے یہ شعر لوح دل سے اُس وقت صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوئے جب سید ابوالاعلیٰ کا رسالہ ''تجدید و احیاے دین'' میں نے پہلی مرتبہ پڑھا۔ سید مرحوم کا یہ رسالہ درحقیقت اُس قافلۂ دعوت وعزیمت کی مختصر تاریخ ہے جو احقاق حق اور ابطال باطل کے لیے اِس امت کے ہر دور میں سرگرم عمل رہا ہے۔ یہ میری زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اپنی تاریخ کی اِس متاع گراں بہا سے مجھے تعارف حاصل ہوا۔

اِس سے پہلے مجھے معلوم نہ تھا کہ حق جب علم و تحقیق کی خلوتوں سے نکل کر ابن حنبل اور ابن تیمیہ کے وجود میں مجسم ہو جاتا ہے تو اُس کی شان کیا ہوتی ہے۔ میں اُس کے جلال و جمال سے حیرت زدہ تھا کہ دفعۃً خیال ہوا: پچھلے ہزار سال سے یہ آفتاب ہمارے افق پر جلوہ نما ہے، لیکن اِس امت کی شب تیرہ پھر بھی سحر نہ ہوئی؟ اب سے بیس برس پہلے خیال و خامہ کے لیے اِس سے آگے باہم رشتہ بپا ہونا شاید ممکن نہ تھا، اِس لیے بات یہاں ختم ہوگئی کہ:

میں پوچھتا ہوں کہ میری ہزار سالہ نوا
یہ کیا کہ اِس پہ ہمیشہ رہی ہے بے تاثیر!

لیکن اِس کے بیس برس بعد میں جانتا ہوں کہ اِس دیار میں ساری اہمیت نوا ہی کو حاصل ہے۔ اِس سے بحث نہیں کہ سننے والوں کا ردعمل کیا ہوا۔ بحث اِس سے ہے کہ کہنے والوں نے کیا کہا اور کس شان سے کہا۔ اُن کی بات اگر 'اِیْتُوْنِیْ بِشَیْءٍ مِّنْ کِتَابِ اللّٰہِ وَ سُنَّۃِ رَسُوْلِہٖ' کے سوا، اور وہ خود اگر اپنے پروردگار کے سوا ہر چیز سے بے تعلق رہے تو سمجھ لیجیے کہ اُنھوں نے بازی پالی۔ پھر اِس سے غرض نہیں کہ قوم نے اُنھیں دار پر کھینچا، اُن کی پیٹھ پر تازیانے برسائے یا اُن کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے۔ اِس کام میں حاصل کی ساری بحث پھر یہاں ختم ہو جائے گی کہ:

سودا، قمار عشق میں خسرو سے کوہ کن
بازی اگرچہ لے نہ سکا، سر تو کھو سکا

وہ چیز جواب سے کم وبیش نصف صدی پہلے امین احسن کو خانقاہ فراہی سے ابوالاعلیٰ کے ''دارالاسلام'' میں کھینچ لائی تھی، وہ یہی نوا تھی۔ لیکن اِس سے پہلے کہ حق وصداقت کا یہ مزمور فضاؤں میں کچھ ارتعاش پیدا کرتا، ابوالاعلیٰ وقت سے بہت پہلے ''تجدید دین'' سے آگے ''غلبۂ دین'' کے مرحلے میں داخل ہو گئے۔ ابوالاعلیٰ کا یہ اقدام یقیناً اُس سے بڑی ٹریجڈی ہے جو اِس صدی کے شروع میں ابوالکلام کے انقلاب حال سے پیدا ہوئی، اور اِس سے بڑی ٹریجڈی شاید یہ ہے کہ اِس اقدام کے نتیجے میں ابوالاعلیٰ کے جانشین دس بیس برسوں ہی میں اُس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ اب اگر کسی نے قافلۂ دعوت و عزیمت کی تشکیل جدید کا عزم کیا تو مجھے یقین ہے کہ اُس کے لیے سب سے زیادہ پتھر اُنھی کے دامن میں ہوں گے۔ پچھلے چند برسوں میں حلقۂ امین احسن کی علمی تحقیقات کو جو داد ''ترجمان'' اور ''میثاق'' کے صفحات میں ملی ہے، یہ درحقیقت اِسی سنگ باری کی ابتدا تھی۔ تاہم وقت سے پہلے اسلامی انقلاب کی تلاش میں ہمارے یہ دوست جہاں پہنچ چکے ہیں، وہاں یہ بھی کچھ کم ہی رہی:

وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے

اب کم وبیش نصف صدی کے بعد، جب علم وتحقیق کی وادیوں میں امین احسن کا خاموش سفر اِس امت میں پھر ایک قافلۂ دعوت وعزیمت کی تمہید بن رہا ہے، معلوم نہیں کیوں، جی چاہتا ہے کہ اہل ''منصورہ'' کے لیے زبور مقدس کی یہ دعا اُن کی محراب مسجد میں لکھ دوں:

''اے خداوند میری دعا سن
اور میری فریاد تیرے حضور پہنچے
میری مصیبت کے دن مجھ سے روپوش نہ ہو
اپنا کان میری طرف جھکا
جس دن میں فریاد کروں، مجھے جلد جواب دے
کیوں کہ میرے دن دھوئیں کی طرح اڑتے جاتے ہیں
اور میری ہڈیاں ایندھن کی طرح جل گئیں
میرا دل گھاس کی طرح جل کر سوکھ گیا
کیوں کہ میں اپنی روٹی کھانا بھول جاتا ہوں۔''

[۱۹۸۹ء]

بہ آشیاں نہ نشینم

وہ ہستی دنیا سے رخصت ہوگئی جس کا وجود ہمارے لیے رحمت خداوندی کا سایہ تھا۔ ۱۹؍جنوری ۸۶ء کی صبح والد محترم وفات پا گئے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اپنے پاؤں سے چلتے اِس دنیا کو چھوڑیں۔ اللہ نے اُن کی یہ خواہش پوری کر دی۔ وہ سوئے تو کسی

کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اگلی صبح نہ دیکھیں گے۔ رات کو معمول کے مطابق تہجد کے لیے اٹھے، وضو کیا، معلوم ہوا سانس لینے میں کچھ دشواری محسوس کر رہے ہیں۔ ہم سب اُن کے پاس چلے گئے۔ خیال تھا، ابھی سنبھل جائیں گے، لیکن یہ دم ٹھیرنے کے لیے نہیں اکھڑا تھا۔ بستر کے پاس کھڑے تھے۔ ہم نے دیکھا، وہ شاید لیٹنا چاہتے ہیں۔ میں نے مدد کی، اُنھوں نے تکیے پر سر رکھا اور لمحوں میں ہم سے جدا ہو گئے۔

زندگی کا سفر اُنھوں نے اِس بیسویں صدی کے ساتھ شروع کیا۔ بیس بائیس سال کے تھے کہ تصوف کی وادی میں قدم رکھا۔ پھر پوری زندگی وفاداری بشرط استواری کی تصویر بنے رہے۔ جسے دین سمجھا، اُس میں کبھی رخصت کی راہ تلاش نہیں کی۔ اپنے شیخ سے بے حد تعلق خاطر تھا۔ کبھی کبھی بڑے درد وسوز کے ساتھ یہ مصرع پڑھتے:

چھوٹی عمرے پریت لگائی ہو گیا سی جو ہونا

میرے اور اُن کے نظریات میں زمین وآسمان کی دوری رہی۔ وہ مجھے اپنے نقطۂ نظر کا قائل کرنے کی کوشش کرتے، میں اُن کے سامنے قرآن وسنت کا نقطۂ نظر پیش کرتا۔ بحث ومناظرہ کی صورت بھی پیدا ہو جاتی، لیکن اللہ کا شکر ہے کہ باہمی تعلق میں کبھی دوری پیدا نہیں ہوئی۔ گویا وہی معاملہ تھا:

کہ در نہایت دوری ہمیشہ با اویم

وہ ہمیشہ میرے پاس رہے۔ حق یہ ہے کہ میں اُن کی خدمت کا حق ادا نہ کر سکا،

لیکن اِس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنی محبت کا حق پوری طرح ادا کر گئے۔

اُن کا آبائی پیشہ زمین داری تھا۔ دادا مرحوم کی وفات کے بعد طب سے شغف ہوا۔ پھر اُسی کے ہو رہے۔ جو کمایا، اُس میں سے اپنی ذات اور اپنے اہل وعیال پر بہت کم خرچ کیا۔ بارہا سب کچھ شیخ کی نذر کر دیا۔

دنیا کی ہر چیز سے بے تعلق رہے۔ غم اور خوشی کی ہر حالت میں مطمئن اور اپنے معمولات پر قائم۔ صبح نکلتے، اکثر شام کو لوٹتے۔ باہر جب دیکھا، یہی محسوس ہوا کہ وہ صرف سفر سے دل چسپی رکھتے ہیں، اُن کی کوئی منزل نہیں ہے۔ گویا زبان حال سے کہہ رہے ہیں:

بہ آشیاں نہ نشینم ز لذت پرواز
گہے بہ شاخ گلم، گاہ برلب جویم

راہ چلتے جس طرح کسی کے پاس چند لمحوں کے لیے وہ بیٹھ جاتے تھے، اُسی طرح بیٹھے اور سفر ختم ہو گیا۔ ہم، بے شک نہیں جانتے کہ ہمارا سفر کب ختم ہو گا، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اُسے بہر حال ختم ہونا ہے۔ اِس عالم کی سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ:

عاقبت منزل ما وادی خاموشان است

[۱۹۸۶ء]

انسانم آرزوست

رومی کا شعر ہے:

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

میں نے بھی اِس شہر میں بارہا دام و دد سے رنجیدہ خاطر ہو کر کسی انسان کی جستجو کی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ اُس میں زیادہ تر ناکامی ہوئی، لیکن پچھلے پندرہ برسوں میں یہ جستجو کبھی کبھی کامیاب بھی رہی ہے اور میں اپنے ٹمٹماتے چراغ کے ساتھ تنہا گھر واپس نہیں آیا۔ اِنھی نادر موقعوں میں سے ایک وہ موقع بھی تھا، جب میں نے پہلی مرتبہ اصغر نیازی کو دیکھا۔

۱۹۷۳ء کی ایک صبح وہ برادرم مستنصر میر کے ساتھ میری قیام گاہ پر آئے۔ بیماری سے خستہ و بے حال تھے، لیکن پہلی ہی نظر میں محسوس ہوا کہ اِس مردِ آزردہ کا دل اِس کی آنکھوں میں دھڑکتا اور اِس کا وجود اِس کی پیشانی سے بولتا ہے۔ میں نے مستنصر کی طرف دیکھا اور طالب عیشی کا یہ شعر بے اختیار زبان پر آیا:

کہاں ہم اور کہاں یہ نکہت گل
نسیم صبح، تیری مہربانی

میں نے عرض کیا: اگر لاہور ہی میں قیام کا ارادہ ہے تو میرے ہاں رہیے۔ بے تکلف مان گئے۔ وہ دن اور آج کا دن، میں نے جب بھی کچھ عرض کیا ہے، وہ اِسی طرح مانتے رہے ہیں۔ اِس تیرہ سال کے عرصے میں وہ میرے پاس بھی رہے اور بارہا مہینوں کے لیے اپنے گھر میانوالی بھی چلے گئے۔ اِس دوران میں مجھ پر وہ دن بھی آئے کہ: سحرم دولت بیدار ببالین آمد، اور میری طلب و جستجو کی سرگردانیوں نے وہ وقت بھی دیکھا کہ جس کے بارے میں بیدل نے کہا تھا: کہ دستے گر کنم پیدا، نمی یابم گریباں را، لیکن میں نے اپنے لیے اُن کی محبت میں کبھی کوئی کمی نہیں دیکھی۔

میرے ساتھ اُن کی اِس محبت کا معاملہ ہمیشہ عجیب رہا۔ وہ اپنے دینی نقطۂ نظر کے لحاظ سے میرے ساتھ کبھی پوری طرح متفق نہیں ہوئے۔ میں برسوں جن وادیوں میں سرگرداں رہا، اُن سے بھی اُنھیں کبھی کوئی دل چسپی نہیں رہی، بلکہ میں نے یہ داستان اگر کبھی اُنھیں سنانا چاہی تو یہی محسوس ہوا کہ وہ زبان حال سے کہہ رہے ہیں:

ما قصّۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم

از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

ہم دونوں نے کبھی کبھی چاہا کہ اِس تعلق کے لیے کوئی وجہ تعلق بھی ہونی چاہیے۔ چنانچہ میرے ہی ایما سے میری اہلیہ کی بہن کے ساتھ اُن کا نکاح ہوا۔ ۱۹۸۴ء میں وہ اِسی خیال سے دیال سنگھ لائبریری کی ملازمت چھوڑ کر ''المورد'' کے شعبۂ علم و تحقیق سے متعلق ہوئے، لیکن قدرت بھی شاید ہمارے لیے بس اِس تعلق سے زیادہ

کسی تعارف کو پسند نہیں کرتی۔ اِس سال مئی میں اُنھوں نے مہینوں کے پس وپیش کے بعد بالآخر ''المورد'' سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور ۴؍جولائی ۱۹۸۷ء کی صبح اُن کی اہلیہ بھی کم وبیش تین سال کی بیماری کے بعد تین چار برس کی ایک ننھی بچی اپنے پیچھے چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ اب وہ اپنی اِس بچی کے ساتھ جو بقول شبلی: لاڈلی ہے کہ کسی اور کے بس کی بھی نہیں، اُسی طرح میرے پاس آتے ہیں جس طرح اب سے چھ برس پہلے آیا کرتے تھے۔ اُن کی محبت میں وہی اخلاص اور اُن کے تعلق میں وہی شان ہے۔ وہ کل رات پھر بڑی دیر تک میرے پاس بیٹھے رہے اور میں عالم تصور میں مستنصر کو دیکھتا رہا:

نسیم صبح، تیری مہربانی

[۱۹۸۷ء]

قافلۂ بے خوداں

۳ اور ۴؍جنوری ۱۹۸۸ء کی درمیانی رات ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی کم وبیش ساٹھ سال دنیا میں گزار کر اپنے خالق کے پاس پہنچ گئے۔ رات کو اُنھوں نے حسب معمول نماز عشا کے بعد اپنا کلینک بند کیا، گھر آئے، کھانا کھایا اور لیٹ گئے۔ تھوڑی دیر کے

بعد معلوم ہوا کہ سانس اکھڑ رہی ہے۔ اُن کے چھوٹے بیٹے زاہد سلمہ اُنھیں اُسی وقت ہسپتال لے گئے۔ وہاں وہ اپنے پاؤں سے چل کر بستر تک گئے۔ لیکن اِس سے پہلے کہ معالج کا ہاتھ اُن کی نبض تک پہنچتا، روح نے بدن کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے:

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل!
گرمی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

اب سے دو سال پہلے اِسی جنوری کی ۱۹ تاریخ کو میرے والد اور اُن کے ماموں ہم سے رخصت ہوئے تھے۔ ہمارے خاندان میں اُن کا ہم مشرب اگر کوئی فی الواقع تھا تو وہ ہمارے یہ ڈاکٹر صاحب ہی تھے۔ اُنھوں نے بھی اِسی طرح لمحوں میں رخت سفر باندھا اور لمحوں میں منزل پر پہنچ گئے تھے۔ اِس قافلۂ بے خوداں کی روایت شاید یہی ہے:

از ساز و برگ قافلۂ بے خوداں مپرس
بے نالہ می رود جرس کاروان ما

وہ میری بہن کے میاں تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے لیے وہ ہمیشہ بہنوئی کم اور بھائی زیادہ رہے۔ میں نے اپنا بچپن اُن کے بہت قریب، بلکہ گاہے گاہے اُن کے پاس رہ کر گزارا ہے۔ مجھے وہ دن کبھی نہیں بھولتا، جب میں دس بارہ سال کی عمر میں ایک امتحان کے سلسلے میں شہر گیا اور وہاں مجھے اُن کی توقع سے بہت زیادہ تاخیر ہو گئی۔

امتحان سے فارغ ہو کر جب میں رات گئے گھر پہنچا تو وہ میرے انتظار میں باہر ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ جس طرح میری طرف لپکے، جس محبت کے ساتھ اُنھوں نے آگے بڑھ کر میرا قلم دوات اور بستہ میرے ہاتھ سے لیا اور جس انداز سے وہ مجھے میری بہن سے ملانے کے لیے رسوئی کی طرف دوڑے، اُس کے تصور ہی سے جو حلاوت اب بھی رگ رگ میں اتر جاتی ہے، اُس کے بارے میں کیا عرض کروں:

عشق می گویم و جاں می دہم از لذت وے

میں نے اُن کا وہ دور بھی دیکھا ہے، جب پاک پتن کے زمانۂ قیام میں ایک بڑے زمین دار نے اُن کے ایک قطعۂ زمین میں سے آب پاشی کی نالی کھودنا چاہی تو اُس کے دس تبردار کارندے بھی اُن کے عزم کو شکست نہیں دے سکے، اور میں نے اِن پچھلے دس برسوں میں یہ بھی دیکھا کہ کوئی شخص اگر کدال بیلچہ لے کر اُن کے سر پر نالی کھودنے کے لیے بھی آ گیا تو اُنھوں نے اف نہیں کی۔ اپنے کلینک میں بیٹھ کر دوستوں کو اہل تصوف کے روایات و قصص سنانے اور ہر نماز میں پورے اہتمام کے ساتھ مسجد کی حاضری کے سوا اب اُنھیں کسی چیز سے کوئی دل چسپی نہ رہی تھی۔ گھر میں بچوں کے بیاہ شادی کا معاملہ ہو یا اعزہ سے میل ملاپ کے مسائل، وہ اب ہر چیز سے بے تعلق تھے۔ اُن کے پاس لوگوں کو سنانے کے لیے حکایتیں تو بہت تھیں، لیکن شکایتوں سے اپنا دامن اب اُنھوں نے بالکل خالی کر لیا تھا۔ ایک تنازع میں وہ فی الواقع بے قصور تھے، لیکن جب میں نے دوسرے فریق کو گلی کی موڑ تک آنے کے لیے آمادہ کر لیا اور

آدھی رات کے وقت اُن سے درخواست کی کہ اب وہ خود آگے بڑھ کر اُسے گھر لے آئیں تو جس طرح بغیر کسی توقف کے وہ بستر سے اٹھے، اُس کا تاثر وہ چیز نہیں جو کبھی دل و دماغ کے لیے اجنبی ہو سکتی ہے۔ اُن کا معاملہ اب وہی تھا کہ:

نہ سنو، گر برا کہے کوئی
نہ کہو، گر برا کرے کوئی
روک لو، گر غلط چلے کوئی
بخش دو، گر خطا کرے کوئی

میرے دینی نقطۂ نظر سے اُنھیں کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ اُن کے سب بچے اُس راہ پر چل پڑے جو میں نے اپنے لیے اختیار کی ہے، لیکن میرے ساتھ اُن کی محبت ہمیشہ اُسی شان کے ساتھ قائم رہی جس طرح آج سے بیس پچیس سال پہلے جب وہ مجھے بہلانے کے لیے میرے ساتھ بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے، میں اُسے محسوس کرتا تھا۔ لوگ مجھ سے تعزیت کرتے ہیں کہ تمھاری بہن بیوہ ہو گئی۔ میں اُنھیں کس طرح بتاؤں کہ اُس کا بھائی بھی اپنے بھائی اور بچپن کے دوست سے محروم ہو گیا ہے۔

جانے والے، تجھے میرے آنے کی خبر ہوئی تو پچھلے جمعہ کے دن تو کھانے سے ہاتھ روک کر شام تک میرا انتظار کرتا رہا۔ دیکھ، اب صبح قیامت تک میں تجھ سے ملاقات کا منتظر رہوں گا:

گوش مہجور پیام و چشم محروم جمال
ایک دل، تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے!

[۱۹۸۸ء]

حریف صرصر و باراں

چنار و سرو و صنوبر کھڑے تو ہیں لیکن
مری نگاہ میں کونپل کی نازک اندامی!
ہوا، یہ طفل، یہ بادل، یہ نخل، یہ صرصر
نہیں ہے باغ میں کوئی غریب کا حامی

میں روز و شب کے تسلسل میں دیکھ سکتا ہوں
مثال کاہ تھی کونپل، شباب پر آئی
فلک مقام درختوں کے درمیاں ابھری
حریف صرصر و باراں! وجود رعنائی!

یہ برگ نرم سے نخل بلند کی صورت
کسی کے حسن تخیل کی دیر پیوندی
ذرا نگاہ تدبر سے دیکھیے اِس کو
کہاں سے پائی ہے ذرے نے شان الوندی؟

ورق ورق سے نمایاں ہیں قدرتیں کس کی!
نفس نفس میں فروزاں ہیں رحمتیں کس کی!

www.ghazali.net

اب سے برسوں پہلے میں نے بات یہاں ختم کر دی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ یہ کونپل جو اِن سب مراحل سے گزر کر فلک مقام درختوں اور سرسبز وشاداب کھیتوں میں بدلتی ہے، اِس کے لیے اگلا مرحلہ ہرم وشیب کا ہے۔ یہ جب کمال کو پہنچتی ہے تو اِس کا زوال بھی اِس کے ساتھ ہی شروع ہو جاتا ہے:

ہلال بدر ہوا ہے، ہلال ہونے کو

پچھلے دنوں میری اہلیہ کے والد دنیا سے رخصت ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ یہی تصویر اُن کی میت میں پوری طرح مجسم ہو گئی ہے۔ وہ اِس دنیا میں شعور کی عمر کو پہنچے تو اُن کا احساس تھا کہ اُن سے زیادہ بے سہارا شاید دوسرا کوئی نہیں ہے، لیکن کم وبیش ساٹھ سال اِس دشت شش جہت کے نشیب وفراز میں سرگرداں رہنے کے بعد وہ جب

شہرِ خموشاں کے لیے روانہ ہوئے تو معلوم نہیں، کتنوں نے محسوس کیا کہ اُن کے بعد وہ اِس دنیا میں ایک بڑے سہارے سے محروم ہو گئے۔ اُن کی میت کے پاس اُن کے متعلقین میں سے ہر شخص معترف تھا کہ:

خود گرفتار رہا تاکہ میں آزاد رہوں
اُس نے غم اِس لیے کھائے تھے کہ میں شاد رہوں

پچھلے بارہ سال خود میں نے اُن کی شفقت و محبت کے زیرِ سایہ بسر کیے ہیں۔ اپنی زندگی کے اُن مراحل میں جہاں دوچار بہت سخت مقام آئے ہیں، میں نے اپنے لیے بھی اور اپنے مقاصد کے لیے بھی اُن کے اخلاص میں کبھی کوئی کمی نہیں دیکھی۔ وہ ایک کونپل کی طرح ابھرے اور حق یہ ہے کہ برسوں حریف صرصر و باراں رہے، اور اِس طرح رہے کہ:

نہیں تھا باغ میں کوئی غریب کا حامی

اب یہ شجرِ سایہ دار پیوندِ زمین ہو چکا ہے۔ اِس دنیا میں کوئی عاقل کیا لمحے بھر کے لیے بھی تصور کر سکتا ہے کہ اِس کے ورق ورق سے نمایاں جو قدرتیں ہم نے بچشمِ سر دیکھی ہیں، وہ اپنی اِس تخلیق کو ہمیشہ کے لیے مٹی کر دیں گی؟ نہیں، ہرگز نہیں، یوم قیامت کی قسم اور نفسِ ملامت گر کی قسم، یہ مٹی میں ملی ہوئی ہڈیاں اور یہ ریزہ ریزہ بکھرے ہوئے وجود کے ذرے سب جمع ہوں گے۔ ہماری انگلیوں کی پور پور پھر اُسی طرح بنا دی جائے گی اور ہم ایک مرتبہ پھر نغمہ سرا ہوں گے کہ:

ورق ورق سے نمایاں ہیں قدرتیں کس کی!
نفس نفس میں فروزاں ہیں رحمتیں کس کی!

[۱۹۸۹ء]

ہم نفس

اِس دنیا میں ہر چیز میسر ہو سکتی ہے، لیکن اِس کے شب و روز کی تلخیوں میں کوئی ہم نفس میسر ہو جائے، یہ حادثہ شاید ہی کبھی ہوتا ہو۔ ہم لوگ جو رعنائی خیال کے لیے زبان پیدا کر سکتے اور حسن تصور کو سپرد قلم کر سکتے ہیں، اپنے لیے بہت سے مداح اور دسیوں رفقا میسر کر لیتے ہیں، لیکن وہ شے جو وجود کے اعماق میں کہیں خلوت نشیں ہے، اُس کا معاملہ وہی رہتا ہے کہ:

آرزوے ہم نفس می سوزدش
نالہ ہاے دل نواز آموزدش

اِس میں شبہ نہیں کہ قلم و قرطاس کی دنیا میں جذب و کشش کا بڑا سامان ہے اور اِس میں بھی شبہ نہیں کہ دنیا کی رنگینیوں میں کھو کر آدمی بسا اوقات ہر چیز سے بے گانہ ہو جاتا ہے، لیکن علم و دانش کی اِن ساری دل فریبیوں کے باوجود راہ حیات کے نشیب و فراز

اگر کبھی اِس آرزو کو زندہ کر دیں تو وہی صورت پیدا ہو جاتی ہے کہ:

مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں

اِس طرح کے موقعوں پر میں نے کئی بار محسوس کیا ہے کہ ذرا چھیڑنے کی دیر ہوتی ہے، پھر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دل کا ساز بس تشنۂ مضراب ہی تھا۔ دنیا کی مشغولیتیں لمحے بھر کو فرصت دیں تو آنکھیں اِس طرح امڈ پڑتی ہیں کہ بند دروازوں کے پیچھے بارہا چیخ سی نکل جاتی ہے:

زار نالیدم صدائے برنخواست

میرے دوستوں کو شکایت رہتی ہے کہ تم ہر چھ سات مہینوں کے بعد شہر کی ہجو شروع کر دیتے ہو اور اپنے ہر دوست سے پوچھتے ہو کہ تمھارا کیا خیال ہے، میں کسی گاؤں میں نہ چلا جاؤں؟ اُن کی یہ شکایت بے جا تو نہیں، لیکن اپنے اِن ہم سفروں سے اگر کہوں تو کس طرح کہوں کہ:

ہم نفس فرزند آدم را کجاست؟

اِن دنوں چند دوستوں کے اصرار پر اُنھیں ''جاوید نامہ'' پڑھا رہا ہوں۔ اِس کی ''تمہید زمینی'' کو تھوڑی دیر کے لیے اگر اپنے محسوسات سے ہم آہنگ کر لوں تو دیکھیے، میں بھی آخر اِس کے سوا کیا کہنا چاہتا ہوں کہ:

عشق شور انگیز بے پروائے شہر　　شعلۂ او میرد از غوغائے شہر
خلوتے جوید بہ دشت و کوہسار　　یا لب دریائے نا پیدا کنار

من کہ در یاراں ندیدم محرمے　　برلب دریا بیاسودم دمے
بحر و ہنگام غروب آفتاب　　نیلگوں آب از شفق لعل مذاب
کور را ذوق نظر بخشد غروب　　شام را رنگ سحر بخشد غروب
با دل خود گفتگوہا داشتم　　آرزوہا، جستجوہا داشتم

تشنہ و دور از کنار چشمہ سار
می سرودم ایں غزل بے اختیار

اقبال نے اِس کے بعد مولویٔ معنوی کی ایک غزل نقل کی ہے۔ وہ اقبال کا مضمون ہوا، میں اگر اپنے وجود سے پوچھوں تو: بشنو از نے چوں حکایت می کند:

خوشا یہ وقت کہ پھولوں نے پیرہن بدلا
چمن میں ماہ سے اتری ہے رات کی مہماں
مری نگاہ کتابوں کے ڈھیر سے اٹھی
کہ اِس ہجوم خموشاں میں کچھ نہیں پنہاں

مرے ندیم، کئی بار آخر شب میں
مرے چراغ کی لو میں بنی تری تصویر
کنار آب اندھیروں میں ڈوب کر ابھری
خیال خواب میں خواب خیال کی تعبیر

ندیم شوق، اِدھر ئہ برس سے شام و سحر
رہ حیات میں کانٹوں کی جستجو میں ہوں
تو اِس سفر کے منازل سے بے خبر تو نہیں
ترے سوا میں زمانے میں کس سے عرض کروں؟

یہ دور اہل محبت کو سازگار نہیں
ترا خیال بھی اب تو وفا شعار نہیں

[۱۹۸۹ء]

دیدۂ صورت پرست ماست

یہ ربیع الاول کا مہینا ہے۔ اِس مہینے میں وہ ہستی عالم وجود میں آئی جسے خود عالم کے پروردگار نے رحمۃ للعٰلمین قرار دیا۔ جس کی پوشاک اور جس کی ران پر ابن مریم نے دیکھا کہ اُس کا ایک نام لکھا ہوا ہے: خداوندوں کا خداوند اور بادشاہوں کا بادشاہ؛ وہ جو قیامت تک کے لیے سرور عالم ہے؛ جس کا قلم روز مین کے سارے کناروں تک پھیلا ہوا ہے؛ جسے جوامع الکلم عطا ہوئے؛ جس کے لیے ساری زمین مسجد بنا دی گئی؛ جس کی ہیبت سے کفر لرزہ براندام ہوا؛ جسے میزان عطا ہوئی اور اِس کے ساتھ لوہا بھی

کہ وہ اِس کے ذریعے سے لوگوں پر خدا کی حجت پوری کر دے؛ جس پر نبوت ختم ہوئی؛ قرآن نازل ہوا اور جس کے بارے میں یہ فیصلہ لوح گیتی پر ثبت کر دیا گیا کہ صبح نشور تک اب خدا کی غیر متبدل ہدایت اُس کی لائی ہوئی کتاب کے سوا کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتی۔

وہ ہستی اِسی مہینے میں منصۂ عالم پر جلوہ فرما ہوئی۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اُس کی نسبت سے یہ مہینا رشک دہر ہے اور جی چاہتا ہے کہ اِس کا ایک ایک لمحہ جشن مسرت میں بسر ہو، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ صدیق و فاروق، عثمان و حیدر اور بلال و بوذر نے، جن کی اِس ہستی سے محبت و عقیدت کا سرمایہ ہی اُن کا اثاث البیت تھا، نہ اِس ماہ کو ''ماہ جشن'' بنایا اور نہ اِس دن کو ''عید میلاد'' قرار دیا جس کی صبح درخشاں میں یہ دعائے خلیل اور نوید مسیحا پہلوئے آمنہ سے ہویدا ہوئی۔ وہ دنیا میں تھے تو یہ دن بارہا طلوع ہوا اور یہ مہینا بارہا آیا، مگر اُن کے شب و روز کا دریا اپنے راستے پر بہتا رہا۔ آسمان کی آنکھوں نے لمحہ بھر کے لیے بھی اُس میں کوئی تموج نہیں دیکھا۔ یا للعجب، یہ ماجرا کیا ہے؟

''یوم اقبال''، ''یوم جناح'' ـــــ اِس ہستی کے مقابلے میں یہ لوگ ہی کیا تھے، لیکن اِن کے مداح اگر اِن کے یوم پیدایش پر یہ اہتمام کر سکتے ہیں تو اِس دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل کے لیے کیوں نہیں، جس نے:

غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا

میں برسوں اِس خلجان میں مبتلا رہا، مگر للہ الحمد کہ بالآخر یہ عقدہ حل ہوا۔ حقیقت

نمایاں ہوئی تو یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ ہمارے فکر کی ساری نارسائیاں درحقیقت ہمارے زاویۂ نگاہ سے پیدا ہوتی ہیں:

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ
جرم نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

بات دراصل یہ ہوئی کہ ہم نے اُسے سب سے بڑا تو مانا، مگر اُنھی شخصیتوں کے زمرے سے مانا جن سے ہم مانوس تھے اور وہ اِس زمرے کا شخص ہی نہ تھا۔ چنانچہ یہ اِسی کا نتیجہ تھا کہ زمین پر سارے دن اُس کے تھے، مگر ہمارے لیے وہ ایک خاص دن میں پیدا ہوا؛ وہ ہر مہینے کا ماہ تاباں تھا، مگر ہم نے اُسے جب دیکھا، ربیع الاول ہی کے مطلع پر دیکھا؛ تقویم خداوندی میں ہر سال اُسی کے نام سے معنون تھا، مگر ہماری تقویم میں اُس کا یوم ولادت ۵۷۰ بعد مسیح ہوا:

جرم نگاہ دیدۂ صورت پرست ماست

ہم نے چاہا کہ ہم سمندر کو کنوئیں میں بند کریں، صحرا کو صحن میں اتاریں اور آسمان کو ردا بنائیں، لیکن وہ جو اُس کے ساتھی تھے ـــــ صدیق و فاروق، عثمان و حیدر، بلال و بوذر ـــــ اُنھوں نے سمندر کو سمندر، صحرا کو صحرا اور آسمان کو آسمان دیکھا، تب اُن پر واضح ہوا کہ وہ جس کی یاد کی شمعیں ہر دل میں فروزاں رہنی چاہییں اور جس کا نام جب دن پہلو بدلے، ہر مسجد کے میناروں سے بلند ہونا چاہیے، یہ اُس کی شان سے فروتر ہے کہ اُسے ایک یوم میلاد اور ایک ماہ ربیع الاول کی شخصیت بنایا جائے۔ وہ عزیز

از جاں اور عزیز جہاں ایک دن اور ایک مہینے کی شخصیت نہیں ہوسکتا۔ وہ تو ہر دن، ہر مہینے اور ہر سال کی شخصیت ہے، اِس لیے نہ ''عید میلاد النبیؐ'' نہ ''جشن ربیع الاوّل''، بلکہ صبح دم، دن ڈھلے، لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ، ایک ہی صدا اور ایک ہی نغمہ: 'اشهد ان لا اله الّا الله، اشهد ان محمدًا رسول الله'۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ

[۱۹۹۰ء]

ہستی کا اعتبار

اِس ملک کے سب سے بڑے شہر پر قیامت گزر گئی۔ آدمی، آدمی کا شکاری ہوا۔ خنجیر سڑکوں پر تڑپے، نطاق کھولے گئے، بدن نوچے گئے، وہ جنھیں ابھی اپنے وجود کا بھی شعور نہ تھا، ماؤں کی آغوش ہی میں ذبح کر دیے گئے۔ یہ کس گناہ میں مارے گئے؟ کیا یہ سب مسلمان تھے؟ اِس پر کون ماتم کرے؟ ادیبوں نے قلم کھینچ لیے، شاعروں کی زبان قلم ہو گئی، سعدی سے کہیے کہ وہ قبر سے اٹھے اور ایک مرتبہ پھر پکارے کہ:

اے محمد، گر قیامت سر بروں آری ز خاک
سر بروں آرد قیامت درمیان خلق بیں

زمین کو چاہیے تھا کہ پھٹ جاتی۔ آسمان کا حق تھا کہ لہو برساتا۔ اور اپنے بارے میں کیا کہوں:

مرا اے کاشکے مادر نہ زادے

ہم اِس لیے زندہ تھے کہ یہ سب دیکھیں۔ آنکھیں دیوار ہوگئیں، دل لہو روتا ہے، ہم اپنے ہی وجود کے صحرا میں کھڑے ہیں اور: لخت جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل۔ ہم جی رہے ہیں۔ ہم شاید نہیں جی رہے:

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا

یہ کس کے ایما پر ہوا؟ ہم کیا فی الواقع غیروں کے عشق میں یہاں تک پہنچ گئے کہ:

واں ملے ابرو، یہاں پھیری گلے پر ہم نے تیغ

اِس قوم میں کوئی رہنما نہیں۔ اِس سے پہلے کہ آسمان ہم پر پتھر برسائے، اِن پیران تسمہ پا کو سیاست کے بازار سے اپنی دکانیں اٹھا لینی چاہییں۔ ہماری ماؤں کی کوکھ بند نہیں ہوگئی۔ خدا نے چاہا تو جاہلی عصبیت کے اِن عفریتوں کے مقابلے میں نئے لوگ میدان میں اتریں گے۔ اِس قوم کے نوجوانوں کو سامنے آنا چاہیے۔ ہم اُن کے منتظر ہیں جن کے دل خدا کی یاد سے زندہ اور جن کے دماغ اُس کی کتاب سے روشن ہوں گے۔ جن کی زبان حق کے سوا کچھ نہ کہے گی۔ جن کی فتوت سمندروں کا سینہ چیرے گی۔ جن کا ولولۂ شوق پہاڑوں کے سرنگوں کرے گا۔ خدا کے باغی اور اِس ملک کے دشمن، ان شاء اللہ اُن کے پاؤں کی خاک ہو کر رہ جائیں گے۔ وہ نکلیں، آسمان

کے جنود قاہرہ اب بھی اُن کی مدد کے لیے صف بستہ کھڑے ہیں:

مثل کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی
اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ 'لا تخف'

[۱۹۸۷ء]

www.ghamidi.net

نیا فتنہ

مغرب میں قافلۂ سیاست ومعیشت نے اپنے سفر کی ابتدا دریاؤں کے کنارے آباد نئے تجارتی شہروں سے کی تھی۔ یہ شہر اُن دیہات سے زیادہ دور نہیں تھے، جہاں ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیر دار داد عیش دیتے اور ارباب کلیسا کی پناہ گاہوں کے کلس فلک الافلاک کی خبر لاتے تھے۔ یہ سترھویں صدی کا آغاز تھا اور اب بیسویں صدی اپنے ربع آخر میں ہے۔ اِس سفر میں بعض بڑے سخت مقام آئے ہیں۔ روح اہرمن نے نئے قالب تلاش کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ قرون مظلمہ کے قبا پوش جاگیر دار اب دور حاضر کے سگار بدست تاجر اور صنعت کار ہیں۔ سرمایہ کے خلاف محنت کی جدوجہد تاریخ کے عجائب گھر میں عبرت کا مجسمہ بن چکی ہے۔ یہ کارواں اِس صدی کی ابتدا میں جس منزل تک پہنچا تھا، وہاں آدم کا بیٹا دو نیم ہو گیا ہے۔ اُس کا دماغ کریملن کے حفاظت خانوں

میں محفوظ کر دیا گیا ہے اور اُس کا جسم ریاست کے لنگر خانوں میں ارتقا کے منازل طے کر رہا ہے۔ دوسری طرف یورپ کے تجارتی شہر وجود بشر کے دل و دماغ بن گئے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے دیہات کی دولت بادشاہ کو وجود میں لاتی تھی، اور بادشاہ دہ خداؤں کی پشت پناہی کرتا تھا۔ نئے شہروں کا سرمایہ پارلیمان کو جنم دیتا ہے اور پارلیمان اُس کی حفاظت کرتی ہے۔ ارتکاز دولت کی کرشمہ سازیاں جسد انسانیت میں بدروح کی طرح حلول کر گئی ہیں۔ کریملن کی سنگین دیواروں اور نیویارک کی فلک بوس عمارتوں پر اِسی آسیب کا قبضہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اِس نے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا اور یہاں کے حکمرانوں کی زبان پر اِس کا حکم جاری ہے۔ پوپ اطالیہ کے گوشۂ عافیت میں آرام کر رہا ہے۔ اُس کے محل کا کلس اب بھی فلک آشنا ہے، لیکن مغرب جدید کے بلاد عالیہ میں:

گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

مشرق ایک طویل عرصے تک اِس سیلاب کی گزرگاہ رہا ہے۔ ہمالہ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اُس کی تباہ کاریوں کے آثار نمایاں ہیں۔ پانی اتر چکا ہے، لیکن اپنے پیچھے نشیب و فراز چھوڑ گیا ہے۔ مورخ کا قلم اِس کی داستان سفر رقم کرے گا تو عبرت و حیرت کا ایک جہان وجود میں آئے گا۔ تین صدیوں کے ہمہ گیر غلبہ و استیلا کے بعد یہ عفریت اپنے گھر لوٹ آیا ہے، لیکن اِس کے پہلو سے ایک نیا فتنہ جنم لے چکا ہے۔ ہمالہ کی دیوار کو یاجوج و ماجوج چاٹ رہے

ہیں، اور خدا کے بندے ایک مرتبہ پھر تاریخ کے محشر میں کھڑے ہیں۔

[۱۹۷۹ء]

امین احسن

اسلام کے دور جدید کا دوسرا عالم دنیا سے رخصت ہو گیا۔

۱۹۳۰ء میں امام حمید الدین فراہی نے اِس عالم فانی سے رخت سفر باندھا تو صاحب ''معارف'' سید سلیمان ندوی نے اِس دور کے پہلے عالم کا ماتم کیا تھا۔ اِس کے کم وبیش ۶۷ برس بعد آج ہم فراہی کے جانشین امین احسن اصلاحی کا ماتم کر رہے ہیں۔ سقراط وفلاطوں، ابوحنیفہ اور ابو یوسف، ابن تیمیہ اور ابن قیم ـــــ یہ جس طرح ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے، فراہی و اصلاحی بھی دنیا میں اب ہمیشہ ایک ہی وجود کے دو نام رہیں گے:

چوں تمام افتد سراپا ناز می گردد نیاز
قیس را لیلیٰ ہمی نامند در صحرای من

علم کا جلال و جمال، فقر کا وقار، عجز کی تمکنت، مجسم استغنا، سراپا محبت، خدا کے آخری الہام کا عہد آفریں شارح، دین وشریعت میں ایک نئی دنیا کا نقیب، صاحب طرز

انشا پرداز، صاحب طرز خطیب، حسن تکلم کا وہ انداز کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی:

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں

بات میں سادہ و آزادہ، معانی میں دقیق

میں نے امین احسن کو سب سے پہلے ۱۹۷۳ء میں دیکھا اور پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا۔ میرے لیے اُس وقت اُن کا دروازہ 'درنکشودہ' ہی تھا، لیکن میں نے ہمت کی اور اِسی بند دروازے پر بیٹھ گیا:

بر در نکشودہ ساکن شد در دیگر نہ زد

پھر وہ دروازہ کھلا اور اِس طرح کھلا کہ گویا اپنے ہی گھر کا دروازہ بن گیا۔ اُس دن سے آج تک علم و عمل کی جو دولت بھی ملی ہے، خدا کی عنایت سے اور اِسی دروازے سے ملی ہے:

ملکت عاشقی و گنج طرب

ہر چہ دارم زیمن ہمت اوست

۱۹۸۷ء میں جب میں نے ''دبستان شبلی'' کی داستان لکھی تو امام فراہی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: امین احسن اصلاحی اِسی نابغۂ عصر کے جانشین ہیں۔ وہ اپنے استاد سے آگے نہیں بڑھے تو پیچھے بھی نہیں رہے۔ حمید الدین جس مقام پر پہنچے تھے، اُن کی ساری عمر اِسی کے اسرار و رموز کی وضاحت میں گزری ہے۔ اُن کی ''تدبر قرآن'' تفسیر کی کتابوں میں ایک بے مثال شہ پارۂ علم و تحقیق ہے۔ اُن کے قلم سے پچاس

برس کے معرکوں کی روداد سنیے تو بقول عرفی:

رمح او گوید اگر جنگ وگر صلح کہ من
بہ کشاد گرہ جبہۂ خاقاں رفتم

میں نے لکھا تھا: ''دبستان شبلی'' کی آخری نشانی اب امین احسن ہی ہیں۔ اُن کے تلامذہ واحباب میں کتنے ہیں جو اِس حقیقت سے آگاہ ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ پچھلے دس برس سے اِسی احساس کی آگ ہے جو میرے سینے میں سلگ رہی ہے۔ اِس کی چنگاریاں اپنی ہی راکھ میں دب جاتی ہیں، مگر بجھنے نہیں پاتیں:

کہ آتشے کہ نہ میرد ہمیشہ در دل ماست

اب یہ آخری نشانی بھی دنیا میں نہیں رہی۔ ۱۵؍دسمبر ۱۹۹۷ء کو صبح ۳ بجے، ٹھیک اُسی وقت جب وہ اپنے پروردگار کے حضور میں حاضری کے لیے اٹھا کرتے تھے، ہمیشہ کے لیے اُس کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ اُن کی ساری زندگی قرآن کے اسلوب و مدعا کی مشکلیں حل کرتے ہوئے گزری۔ اب کیا ہے، جہاں مشکل پیش آئے گی، خود صاحب قرآن سے پوچھ لیں گے۔ اُن کی دنیا تو اب وہ ہے کہ جہاں:

بے پردہ جلوہ ہا بہ نگاہی تو اں خرید

امین احسن کیا تھے؟ اب سے کئی برس پہلے جب اِس شہر کے کچھ مذہب فروشوں نے اُن کا مقام معتقدین کی تعداد سے متعین کرنا چاہا تو میں نے اُن کی خدمت میں عرض کیا تھا: مجھے اپنے بارے میں تو کچھ نہیں کہنا کہ میرا سرمایۂ فخر اگر کچھ ہے تو بس یہی

ہے کہ مجھے امین احسن سے شرف تلمذ حاصل ہے، لیکن جہاں تک امین احسن کا تعلق ہے تو میں یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اُس کی تگ و دو کا ہدف وہ چیزیں کبھی رہی ہی نہیں جن پر یہ لوگ جیتے اور مرتے ہیں۔ اِن زخارف کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی اُس نے ہمیشہ اپنی شان سے فروتر سمجھا ہے۔ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کے وہ طریقے جو اِن حضرات کے لیے 'هَنِيئًا مَّرِيئًا' ہیں، اُن کا ذکر بھی کوئی شخص اگر اُس کی مجلس میں کبھی کر دے تو اُس کے لیے وہاں باریابی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اُس نے عمر بھر جس چیز کو اپنا شعار قرار دیا، وہ یہ تھی کہ آدمی کا سایہ بھی اگر اُس کا ساتھ نہ دے تو اُسے ہر حال میں حق پر قائم رہنا چاہیے۔ اُس نے معاشرے میں پھیلی ہوئی فکر و عمل کی سب غلاظتوں کو جمع کر کے اُنھیں دلائل فراہم نہیں کیے، دل و دماغ کو اِن غلاظتوں سے پاک کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ ہر پستی میں نہیں اترتا، اُنھیں اُن بلندیوں کی طرف بلاتا ہے جن پر وہ اپنے شعور کے پہلے دن ہی سے فائز رہا ہے۔ اُس کی دنیا علم و دیانت کی دنیا ہے، مذہبی بہروپیوں اور سیاسی بازی گروں کے لیے اِس دنیا میں کوئی جگہ پیدا ہی نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنے ذرۂ ہستی میں ایک صحرا اور اپنے وجود میں ایک سمندر ہے۔ اُس کی اپنی اقلیم ہی میں اُس کے لیے اتنے مشاغل ہیں کہ اِس طرح کی چیزوں کے لیے اُس کے پاس کوئی وقت نہیں ہوتا۔ اُس نے جس میدان میں عمر بھر محنت کی ہے، وہ پیری مریدی کا نہیں، علم و تحقیق کا میدان ہے۔ اُس کی محنت کا حاصل اگر کسی شخص کو دیکھنا ہو تو وہ اُس شہ پارۂ علم و تحقیق کو دیکھے جسے اب

دنیا ''تدبر قرآن'' کے نام سے جانتی ہے۔ وہ بندۂ امروز نہیں، مردِ فردا ہے اور اُس کا زمانہ اب بہت زیادہ دور نہیں رہا۔

''تدبر قرآن'' کی تسوید کا کام اِس مردِ فردا نے ۱۹۵۷ء میں کسی وقت شروع کیا۔ اِس کی تیاری وہ اُس زمانے سے کر رہے تھے جب ۱۹۲۵ء میں امام فراہی نے اپنے گھر کے کسی گوشے میں کھڑے ہوئے اُن سے کہا تھا: امین احسن اخبار نویسی کرتے پھرو گے یا ہم سے قرآن پڑھو گے؟ وہ بتاتے تھے کہ میں اُس زمانے میں ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا اور اچھے مشاہرے پر کام کر رہا تھا، لیکن میں نے بغیر کسی توقف کے عرض کیا: میں آپ سے قرآن پڑھوں گا۔ امام فراہی نے اپنی اقامت گاہ ہی کے ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: آپ یہاں ٹھیریں گے، اور میں ادارت سے استعفا دے کر ایک مرتبہ پھر طالب علمانہ زندگی گزارنے کے لیے اُس کمرے میں آ کر ٹھیر گیا۔ بعد میں مولانا سید سلیمان ندوی نے کسی کالج میں پروفیسری کے لیے اُن کا نام تجویز کیا اور کالج کے ذمہ داروں سے ہامی بھر لی کہ وہ اُنھیں راضی کر لیں گے۔ امین احسن کو بتایا گیا تو وہ چلچلاتی دھوپ میں پیدل چلتے ہوئے دارالمصنفین پہنچے اور سید صاحب سے عرض کیا: آپ نے اِس فقیر کا نام تجویز کیا، آپ کا شکریہ، لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں یہ پیش کش قبول نہ کر سکوں گا۔ امام فراہی کو میں اُن کی زندگی میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ وہ بتاتے تھے کہ سید صاحب بالکل حیران رہ گئے۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک غریب طالب علم اتنی بڑی پیش کش اِس طرح ٹھکرا دے گا۔ بعد

میں اُنھوں نے ندوہ میں تقریر کرتے ہوئے بڑے تاثر کے ساتھ اِس واقعے کا ذکر کیا اور طلبہ سے کہا کہ دیکھو، طالب علم ایسے بھی ہوتے ہیں۔ بہرحال میں یہ بات کہہ کر چلا آیا، لیکن مجھے اندیشہ رہا کہ استاذ امام اِن دنوں اگر ''دارالمصنفین'' آئے تو ہوسکتا ہے کہ سید صاحب اُن سے بات کریں اور وہ مجھے بھیج دینے کا وعدہ کرلیں۔ اُن کا چہرہ ایک عجیب احساس فخر سے تمتما اٹھتا تھا، جب وہ یہ بتاتے تھے کہ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ استاذ امام وہاں گئے بھی اور سید صاحب نے اُن سے بات بھی کی، لیکن اُنھوں نے صاف کہہ دیا: آپ امین احسن کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں۔ میں یہ ساری محنت آخر کس کے لیے کر رہا ہوں؟

فراہی کی یہ محنت رنگ لائی۔ ۱۹۳۰ء میں جب اُن کی وفات کا وقت قریب ہوا تو اُنھوں نے امین احسن کو بلا بھیجا۔ وہ اُس وقت متھرا کے ایک ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ امین احسن کمرے میں داخل ہوئے تو فراہی نے اُنھیں دیکھ کر کہا: امین آ گئے۔ امین احسن کہتے تھے: اُنھوں نے میرا نام اپنی زبان سے اِس طرح ادا کیا کہ گویا نام نہیں لے رہے، اِس کے معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے علم وفکر کی امانت میرے سپرد کر رہے ہیں۔

امین احسن نے اپنی پوری زندگی اِسی امانت کا حق ادا کرنے میں صرف کر دی۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے: ڈرتا ہوں، خدا کے حضور میں فراہی سے ملوں تو وہ میرے کام سے مطمئن نہ ہوں۔

''تدبر قرآن'' کیا ہے؟ وہ اِس کے تعارف میں لکھتے ہیں:

''میں بلا کسی شائبہ فخر کے، محض بیان واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب میری چالیس سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ اِس کتاب کی تیاریوں میں بسر کیا ہے، اور اب اپنے بڑھاپے کی ناتوانیوں کا دور اِسی کی تحریر وتسوید میں بسر کر رہا ہوں۔ اِس طویل مدت میں، میں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اور بہت سے تلخ وشیریں گھونٹ حلق سے اتارے ہیں، لیکن اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ کسی دور اور کسی حال میں بھی میرا ذہنی وقلبی تعلق اِس کتاب سے منقطع نہیں ہوا۔ میں نے اِس ساری مدت میں جو کچھ پڑھا ہے، اِسی کو محور بنا کر پڑھا ہے۔ جو کچھ سوچا ہے، اِسی کو سامنے رکھ کر سوچا ہے اور جو کچھ لکھا ہے، بالواسطہ یا بلاواسطہ اِسی سے متعلق لکھا ہے۔ میں نے قرآن حکیم کی ایک ایک سورہ پر ڈیرے ڈالے ہیں، ایک ایک آیت پر فکری مراقبہ کیا ہے اور ایک ایک لفظ اور ایک ایک ادبی یا نحوی اشکال کے حل کے لیے ہر اُس پتھر کو الٹنے کی کوشش کی ہے جس کے نیچے سے مجھے کسی سراغ کے ملنے کی توقع ہوئی ہے اور یہ راز بھی میں برملا ظاہر کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی اِس کام میں کوئی تکان یا افسردگی محسوس نہیں کی، بلکہ ہمیشہ نہایت گہری لذت اور نہایت عمیق راحت کا احساس کیا ہے:

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

میری چالیس سال کی محنتوں کے نتائج کے ساتھ ساتھ، اِس میں میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ۳۰، ۳۵ سال کی کوششوں کے ثمرات بھی

ہیں۔ مجھے بڑا فخر ہوتا اگر میں یہ دعویٰ کر سکتا کہ اِس کتاب میں جو کچھ بھی ہے، سب استاذ مرحوم ہی کا افادہ ہے، اِس لیے کہ اصل حقیقت یہی ہے۔ لیکن میں یہ دعویٰ کرنے میں صرف اِس لیے احتیاط کرتا ہوں کہ مبادا میری کوئی غلطی اُن کی طرف منسوب ہو جائے۔ مولانا سے میرے استفادے کی شکل یہ نہیں رہی ہے کہ ہر آیت سے متعلق یقین کے ساتھ اُن کی رائے میرے علم میں آ گئی ہو، بلکہ میں نے اُن سے قرآن حکیم پر غور کرنے کے اصول سیکھے ہیں اور خود اُن کی رہنمائی میں پورے پانچ سال اِن اصولوں کا تجربہ کرنے میں بسر کیے ہیں۔ پھر اِنھی اصولوں کو سامنے رکھ کر آج تک کام کرتا رہا ہوں۔ اِس اعتبار سے اگرچہ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ یہ سب کچھ استاذ ہی کا فیض ہے، لیکن اِس میں چونکہ بلا واسطہ افادے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ افادے کا بھی بہت بڑا حصہ ہے، اِس وجہ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اِس کا جو حصہ مستحکم اور مدلل نظر آئے، اُس کو استاذ مرحوم کا صدقہ سمجھیے اور جو بات کمزور یا غلط نظر آئے، اُس کو میری کم علمی پر محمول فرمایئے۔'' (۱/۴۱)

اُنھوں نے لکھا ہے:

''میں اپنے رب کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اِس کتاب میں کسی ایک آیت کی بھی ایسی تفسیر نہیں کی جس میں مجھے کوئی تردد ہو۔ جہاں ذرا بھی تردد ہوا ہے، میں نے بے تکلف اُس کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اِسی طرح یہ بات بھی عرض کرتا ہوں کہ کسی ایک مقام میں بھی میں نے یہ کوشش نہیں کی ہے کہ کسی آیت کو اُس کے حقیقی مفہوم سے ہٹا کر اپنے کسی نظریے یا کسی خیال کی تائید کے لیے استعمال

کروں۔قرآن سے باہر کی کسی چیز سے بھی کبھی میری کوئی خاص قلبی وذہنی وابستگی نہیں ہوئی۔اگر ہوئی ہے تو قرآن ہی کے لیے اور قرآن ہی کے تحت ہوئی ہے۔ اِس کتاب کے پڑھنے والے محسوس کریں گے کہ جہاں کہیں مجھے اپنے استاذ سے بھی اختلاف ہوا ہے، میں نے بے جھجک اُس کا بھی اظہار کر دیا ہے۔'' (۴۲/۱)

یہ تفسیر لاہور میں بھی لکھی گئی اور برسوں لاہور سے باہر خانقاہ ڈوگراں کے پاس ایک دورافتادہ گاؤں رحمٰن آباد میں سر سے اور شیشم کے درختوں کے نیچے بھی زیرتسوید رہی، جہاں نہ بجلی تھی، نہ پنکھا اور نہ تصنیف وتالیف کے لیے کوئی دوسری سہولت۔ہم نے بارہا دیکھا کہ مسودہ پسینے سے بھیگ رہا ہے، لیکن مصنف کا قلم اُسی طرح رواں دواں ہے۔وہ اِس بات سے آگاہ تھے کہ ـــــ بہر یک گل زحمت صد خارمی باید کشید ـــــ قرآن کی مشکلوں کو حل کرنے اور اُس سے متعلق اپنے نتائج فکر کو سپردِ قلم کرنے میں وہ دنیا کی ہر مشقت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے:

طالباں را خستگی در راہ نیست
عشق خود راہ ست وہم خود منزل ست

امین احسن نے یہ تفسیر قرآن پر ایمان کی جس کیفیت میں لکھی ہے، اُسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے یاد ہے، وہ سورۂ رحمٰن کی تفسیر لکھ رہے تھے۔'یَخۡرُجُ مِنۡهُمَا اللُّؤۡلُؤُ وَالۡمَرۡجَانُ' کے تحت جب یہ مسئلہ سامنے آیا کہ عام خیال کے مطابق موتی صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں، لیکن قرآن بالکل صریح ہے کہ یہ دونوں ہی

پانیوں سے نکلتے ہیں تو اُنھوں نے مجھے تحقیق کے لیے کہا۔ میں نے دیکھا، اُن کے چہرے پر تردد کی کوئی پرچھائیں نہ تھی، بلکہ ایک عجیب اطمینان تھا اور ایمان کی ایک عجیب روشنی تھی۔ اِس موقع پر اُنھوں نے جو کچھ کہا، میں اُسے بعینہٖ تو شاید دہرا نہ سکوں، لیکن مدعا یہی تھا کہ خدا کی قسم، اگر موتی خود آ کر بھی مجھے کہیں کہ وہ صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں تو میں اُن سے کہہ دوں گا: تمھیں اپنی تخلیق میں شبہ ہوا ہے، قرآن کا بیان کبھی غلط نہیں ہوسکتا۔

اُن کی پیدایش ۱۹۰۴ء میں یوپی کے ایک گاؤں بمہور میں ہوئی۔ اُن کے رشتے کے ایک چچا شبلی متکلم ندوی اُس زمانے میں ''مدرسۃ الاصلاح'' کے مہتمم تھے۔ اُنھی کے ایما پر امین احسن کے والد نے جنوری ۱۹۱۵ء میں اُنھیں اِس مدرسہ میں داخل کرا دیا۔ اُن کی ساری تعلیم سرائے میر اعظم گڑھ کی اِسی درس گاہ میں ہوئی۔ یہ ایک دینی مدرسہ تھا، لیکن انگریزی زبان میں اُن کی استعداد اتنی اچھی تھی کہ علوم عالیہ کی کتابیں اِس زبان میں نہ صرف یہ کہ بغیر کسی دقت کے پڑھتے، بلکہ اُن کے ادق مطالب دوسروں کو سمجھا دے سکتے تھے۔ دینی مدارس کے طلبہ بالعموم عربی بولنے پر قدرت نہیں رکھتے، لیکن وہ جب امام فراہی سے استفادے کے لیے اُن کے پاس مقیم تھے تو بے تکلف عربی بولتے تھے۔ مشہور عالم موسیٰ جار اللہ ہندوستان آئے تو امام فراہی سے ملنے مدرسۃ الاصلاح بھی گئے۔ امین احسن ہی اُن کے میزبان تھے۔ عربی زبان میں گفتگو اور تقریر پر اُن کی قدرت دیکھ کر ایک دن اُنھوں نے پوچھا: عرب میں کتنے سال گزار

کر آئے ہو؟ امین احسن نے جواب دیا: 'ما مست قدمی ھاتین قط بلاد العرب' (میرے اِن دونوں پاؤں کو کبھی سرزمین عرب نے نہیں چھوا)۔ موسیٰ جاراللہ بڑی دیر تک اپنی حیرت کا اظہار کرتے رہے۔

اِسی زمانے میں ایک مرتبہ محمد علی جوہر اور سید سلیمان ندوی جیسے لوگوں کی موجودگی میں نوجوان امین احسن نے تقریر کی۔ اُن کی خطابت کا جو رنگ بعد میں نمایاں ہوا اور جس کی داد اپنے وقت کے بے مثل خطیب سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے اِس طرح دی کہ خطیب تو میں بھی ہوں، لیکن تم عالم بھی ہو اور خطیب بھی، اُس کی کچھ جھلک اِس تقریر میں بھی تھی۔ لوگوں نے بہت داد دی، لیکن وہ منتظر تھے کہ استاذ امام کیا کہتے ہیں۔ شام کو درس کے لیے حاضر ہوئے تو کسی نے امام فراہی سے ذکر کیا۔ وہ کچھ دیر دوسروں کی باتیں سنتے رہے، پھر اپنے خاص انداز میں فرمایا: ہاں بھئی، یہ بڑے ابوالکلام آزاد ہیں۔ امین احسن بتاتے تھے کہ اُنھوں نے لفظ 'آزاد' اِس طرح ادا کیا کہ اُن کی یہ تعریف میرے لیے تعریف کم اور تنبیہ زیادہ ہوگئی۔ میرے استاد کی تربیت کا یہی انداز تھا۔

اِس سے پہلے امام فراہی نے مدرسہ کے زمانے میں بھی اُن کی ایک تقریر کی تحسین اِن الفاظ میں کی تھی: ''اِس طالب علم نے بہت اچھی تقریر کی ہے۔'' اِس پر اُن کے استاد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی نے عرض کیا: آپ کی اِس تحسین کی کوئی یادگار بھی اِس کے پاس ہونی چاہیے۔ فراہی نے اپنا ''مجموعۂ تفاسیر'' اُنھیں دیا اور اُس پر لکھا: ''بہ صلۂ حسن تقریر'' اور اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

۱۹۲۵ء میں اُن کے حکم پر وہ مدرسہ کے کسی کام سے ملایا گئے تو اپنے رفیق درس اختر احسن کو خط لکھا۔ اُس میں ایک جملہ یہ بھی تھا کہ: ''سمندر کی سرجوشی کے ایام بہار ہیں۔'' امام فراہی نے پڑھا تو کہا: امین میاں تو ادیب ہیں۔ وہ خود بتاتے تھے کہ زمانۂ طالب علمی میں اگر کوئی شخص اُن سے پوچھتا کہ وہ کیا بننا چاہتے ہیں تو وہ کہتے: ادیب الہند۔

اِس دور میں شاعری کا شوق بھی رہا۔ طبیعت میں شروع سے شوخی تھی۔ مدرسہ میں اپنے ایک استاد کی ہجو لکھ دی۔ مولانا نگرامی نے بلایا، تنبیہ کی، کچھ جرمانہ بھی کیا، لیکن ساتھ ہی فرمایا: اِس میں شبہ نہیں کہ تمھاری نظم بہت اچھی ہے۔ تاہم یہ شوق اُسی زمانے میں ختم ہو گیا۔ بتاتے تھے کہ میں نے شبلی سے موازنہ کیا تو مجھے خیال ہوا کہ میں اُن جیسے شعر نہیں کہہ سکتا۔ اِس کے بعد پھر میں نے اِس کوچے میں قدم نہیں رکھا۔

مدرسہ کے زمانے میں ''سبع معلقات'' کا امتحان ہوا۔ سید سلیمان ندوی ممتحن تھے۔ امین احسن کے پرچے پر اُنھوں نے لکھا: یہ ایک طالب علم کا پرچہ ہے۔ مجھے ندوہ کے لیے اِس طرح کے استاد بھی کہاں سے ملیں گے۔

مدرسہ میں جن لوگوں کی اُن سے چشمک رہتی تھی، اُنھوں نے فراہی سے کہا: امین احسن کو نحو سے کچھ زیادہ مناسبت نہیں ہے۔ بتاتے تھے: میں درس میں حاضر ہوا تو آتے ہی استاذ امام نے پوچھا: امین 'ل' کیا صیغہ ہے؟ میں نے جواب دیا، معنی عرض کیے تو بڑے خشمگیں انداز میں لوگوں کی طرف دیکھا، پھر فرمایا: کون کہتا ہے کہ امین کو نحو

نہیں آتی۔

اِسی طرح کے ایک موقع پر امام فراہی نے اپنے درس کے حاضرین سے پوچھا: اِس درس میں سب سے کم سن کون ہے؟ لوگوں نے کہا: امین احسن۔ اُنھوں نے پوچھا: سب سے بعد میں کون شریک ہوا؟ لوگوں نے کہا: امین احسن۔ اِس پر فرمایا: سیدنا مسیح کا ارشاد ہے کہ کتنے ہیں جو پیچھے آنے والے ہیں، مگر دوسروں سے آگے نکل جائیں گے۔

اپنے اوپر استاد کے اعتماد کا ذکر وہ اِسی اسلوب میں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ بتایا کہ لوگوں نے امام فراہی سے کہا: امین تو کہتے ہیں کہ عربی شاعری بھی کوئی شاعری ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ اونٹنی کی تعریف کر رہے ہیں یا محبوبہ کی۔ امام فراہی نے کہا: اُنھیں کسی نے شعر سمجھایا نہیں ہوگا۔ میں آیا تو اُنھوں نے پوچھا: میں نے وہی بات دہرادی۔ استاذ امام نے کہا: کوئی شعر پڑھو۔ میں نے معلقۂ امرؤالقیس کا پہلا شعر پڑھ دیا: 'قفا نبك من ذكرى حبيب و منزل'۔ امام نے کہا: ترجمہ کرو۔ میں نے اُسی طرح ترجمہ کر دیا جس طرح بالعموم مدرسوں میں کیا جاتا ہے۔ امام نے کہا: نہیں، یوں نہیں۔ اِس طرح ترجمہ کرو کہ: ٹھیرو، ٹھیرو، دوستو، جاناں اور منزل جاناں پہ دو آنسو بہانے دو۔ میں پکار اٹھا: لاریب، شعر ہوگیا، اب یہ شعر ہوگیا ہے۔ وہ کہتے تھے، اِس کے بعد عربی شاعری ہی میری سب سے زیادہ پسندیدہ شاعری ہوگئی۔

فراہی کا ذکر جب اُن کی زبان پر آتا تو آنکھوں میں ایک عجیب چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ اِس کلیم ذروۂ سینائے علم کی باتیں وہ گھنٹوں کرتے، مگر سیر نہ ہوتے تھے۔ بعض

واقعات ایسے دل نواز اسلوب میں سناتے کہ معلوم ہوتا، کسی دیوتا کا ذکر کر رہے ہیں۔

بتاتے تھے: ''سبع معلقات'' پڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ 'لا' سمجھ میں نہیں آیا۔ سب شارحین کو دیکھا، ادیب الہند مولوی فیض الحسن سہارن پوری کی شرح بھی دیکھی، لیکن کسی رائے پر اطمینان نہیں ہوا۔ کتاب لے کر امام فراہی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اپنے دارالمطالعہ کے باہر کھڑے تھے۔ میں نے مشکل بیان کی، لمحے بھر کو رکے، جیب سے پنسل نکالی اور میری کتاب پر لکھا: 'لا ھی نادرۃ'۔ میاں، جس طرح تم لوگ نہیں کہتے کہ جس گھڑی میری موت نہ آ جائے، یہ اِسی طرح کا 'لا' ہے۔ زبان کے غوامض تک پہنچنے کا یہ انداز صرف استاد ہی کا حصہ تھا۔

فراہی کے آخری زمانے میں ہندوستان کے ایک بڑے عالم نے اُن کی کسی تحریر پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ اِس سے پورے علاقے میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ مدرسۃ الاصلاح کے طلبہ اور اساتذہ، سب پریشان تھے۔ میرے لیے بھی یہ ایک بڑا سانحہ تھا۔ اِسی اضطراب اور پریشانی کے عالم میں فراہی کو ڈھونڈتا ہوا اُن کے دارالمطالعہ کی طرف بھاگا۔ میں نے دیکھا، استاذ امام سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ دوڑ کر وہیں اُنھیں بتایا۔ میں خود جس پریشانی میں تھا، اُن سے بھی اِسی کے لحاظ سے کسی ردعمل کی توقع کر رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے زینے پر رکے، پھر یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے: اچھا، یہ جن کا تم ذکر کر رہے ہو، وہ تو مجھے نہیں جانتے۔ میں ہکا بکا اُنھیں دیکھتا کھڑا رہ گیا۔ اِس فتوے پر اِس سے زیادہ بلیغ کوئی تبصرہ شاید کبھی نہ ہو سکے۔ وہ بڑے والہانہ انداز میں کہتے:

فراہی یہ تھے، اِس شان کا کوئی شخص اب تم کہاں سے پیدا کرو گے؟

فراہی سے اُنھوں نے قرآن پڑھا، اُس کی زبان کا وہ ذوق پایا جو شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ نظم قرآن فراہی کی دریافت ہے، لیکن امین احسن نے اپنی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اُسے وہاں پہنچا دیا ہے کہ اُس کے منکر بھی اب انکار کے لیے کوئی راہ نہیں پاتے۔ امین احسن کا پایۂ علم وہی تھا جو اِس امت میں مختلف علوم وفنون کے ائمۂ مجتہدین کا رہا ہے۔ زبان، ادب، فلسفہ وحکمت اور قرآن کے معارف، اِن سب میں وہ جس مقام پر فائز تھے، اُس سے آگے کوئی مقام آسانی سے تصور میں نہیں آتا۔ اِن علوم میں لاریب، وہ اپنے وقت کے امام تھے۔ اُن کی بعض نئی تحقیقات سے متعلق جب کوئی شخص اُن سے متقدمین کے کسی حوالے کا تقاضا کرتا تو وہ بڑے اعتماد کے ساتھ کہتے: مطمئن رہیے، کچھ عرصے کے بعد ہم بھی متقدمین ہی ہو جائیں گے۔ میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ میں نے اُن کی مجلس میں صدیوں کے عقدے لمحوں میں کھلتے دیکھے اور بارہا اعتراف کیا ہے کہ:

طے می شود ایں رہ بدرخشیدن برقے
ما بے خبراں منتظر شمع و چراغیم

اُن کا مقام یہی تھا، لیکن اِس کے باوجود اپنی کسی عزیز سے عزیز رائے اور تحقیق کے خلاف بھی کوئی حق اگر سامنے آ گیا ہے تو اُن کے دل ودماغ کو میں نے اِس طرح اُس کے سامنے جھکتے دیکھا ہے کہ حیرت ہو جاتی تھی۔ اُن کے مدرسۂ علمی کا میں پچھلی

صفوں میں بیٹھنے والا ایک طالب علم ہوں۔ سورۂ توبہ میں 'اشہر حرم' کا مفہوم اُنھوں نے جس طرح متعین کیا ہے، اُس پر مجھے اطمینان نہیں ہوسکا۔ میرا خیال تھا کہ بات بہت سادہ ہے، لیکن اُنھوں نے اِسے جس طرح دیکھا ہے، اِس کے نتیجے میں یہ بہت کچھ الجھ گئی ہے۔ اُنھی کے فیض تربیت سے جو کچھ پایا ہے، اُس کی روشنی میں ایک مرتبہ بہت ڈرتے ڈرتے میں نے اپنا نقطۂ نظر اُن کے سامنے رکھ دیا۔ وہ میری بات سنتے رہے، سوالات بھی کیے، اِس کے بعد چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے، پھر فرمایا: میں نے اِس آیت پر برسوں غور کیا اور اِس کے بعد ایک رائے قائم کی تھی، لیکن تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر بڑے تاثر کے عالم میں یہ شعر پڑھا:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

امام فراہی کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اُنھیں خیال ہوا کہ جس طرح قرآن اُنھوں نے حمید الدین فراہی جیسے جلیل القدر عالم اور محقق سے پڑھا ہے، اِسی طرح حدیث بھی اِس فن کے کسی جید عالم سے پڑھنی چاہیے۔ ترمذی کے شہرۂ آفاق شارح عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری کا گاؤں اُن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ امین احسن کے والد اُنھیں مولانا کے پاس لے گئے، اُنھوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو محدث مبارک پوری نے فرمایا: آپ تو سب کچھ پڑھے ہوئے ہیں۔ آپ کہیے تو میں اپنی سند آپ کو دے دوں۔ امین احسن نے جواب دیا: مولانا یہ شاہوں کا تاج ہے، اِسے یہ

فقیر اِس طرح اپنے سر پر نہیں رکھنا چاہتا۔ میں سند لینے نہیں آیا، آپ سے حدیث سمجھنے آیا ہوں۔ مولانا نے پوچھا: کیا پڑھو گے؟ عرض کیا: آپ ترمذی کے شارح ہیں، وہی پڑھا دیجیے۔ چنانچہ درس شروع ہو گیا۔ پھر سردی ہو یا گرمی، میلوں پیدل چل کر امین احسن پوری باقاعدگی کے ساتھ اُن کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے:

شوق تو راہ می برد، درد تو زادمی دہد

اپنے زمانۂ طالب علمی کا ایک واقعہ وہ بڑے لطف میں سنایا کرتے تھے۔ بتاتے تھے کہ ترمذی کی عبارت پڑھتے ہوئے میں نے ایک جگہ بہت اعتماد کے ساتھ 'عرف' کو 'رُ' کی زیر کے ساتھ پڑھا۔ مولانا نے ٹوکا: 'انا لا اعرف عرِف' (میں اِسے 'رُ' کی زیر کے ساتھ نہیں جانتا)۔ میں نے اِسی اعتماد کے ساتھ جواب دیا: 'اما انا فلا اعرف عرَف' (اور میں اِسے 'رُ' کی زبر کے ساتھ نہیں جانتا)۔ مولانا نے فرمایا: 'راجع اللغة' (لغت دیکھیے)۔ لغت کی کتاب، غالباً جوہری کی صحاح کھولی تو استاد ہی کی بات لکھی ہوئی تھی۔ میں کچھ خفیف ہوا تو مسکرائے، پھر فرمایا: 'استأنف، وللجواد زلة' (آگے چلو، اصیل گھوڑا بھی پھسل جاتا ہے)۔

امام فراہی کی وفات کے بعد اُن کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے اُنھوں نے ''دائرۂ حمیدیہ'' کی بنیاد رکھی۔ اُس کے تحت ''الاصلاح'' کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ اِس دوران میں امام کی کتابوں کے ترجمے کیے اور اِس قدر عمدہ ترجمے کیے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جیسے صاحب طرز انشا پرداز نے اُن کے بارے میں لکھا

کہ کسی شخص کو اگر عربی زبان کی اعلیٰ علمی عبارتوں کے اردو میں منتقل کرنے کا سلیقہ سیکھنا ہو تو اُسے یہ ترجمے دیکھنے چاہییں۔

۱۹۴۱ء میں مولانا مودودی حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت لے کر اٹھے تو مدرسۃ الاصلاح، دائرۂ حمیدیہ، استاد کے مسودات اور علمی کاموں کے لیے اُس زمانے میں اپنے نام پر جمع پچاس ہزار روپے کی خطیر رقم چھوڑ کر وہ اُن کے ساتھ ''دارالاسلام'' منتقل ہو گئے۔ مولانا مودودی سے اُنھیں اتفاق بھی رہا اور اختلاف بھی۔ اتفاق کے زمانے میں جب بعض علما نے اُن کے علم کا استخفاف کرنا چاہا تو امین احسن کی شہادت ایک برہان قاطع بن کر سامنے آئی۔ بعد میں ازراہ تفنن فرمایا کرتے تھے کہ بھائی، وہ میں نے مولویوں کے مقابلے میں اُن کے علم کی شہادت دی تھی، اپنے مقابلے میں نہیں۔ کم وبیش ۱۶ سال وہ مولانا کے سب سے زیادہ قابل اعتماد ساتھی رہے۔ اُن کے ساتھ ''جماعت'' کی علمی وفکری رہنمائی کا کام بھی کیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی بڑی استقامت کے ساتھ برداشت کیں۔ بتاتے تھے کہ قرآن میں تجزیۂ مطالب اور پیروں کی تقسیم کا کام میں نے ملتان جیل میں مکمل کیا تھا۔ ۱۹۵۳ء میں مولانا کو موت کی سزا ہوئی تو اُن کے جذبات بے پناہ تھے۔ اختلاف کے زمانے میں بھی، جب وہ اُنھیں اپنے مخصوص اسلوب میں ''امیر المومنین'' کہتے اور اُن پر تند و تیز لب و لہجے میں تنقید کر رہے ہوتے تھے، میں نے بارہا اُن کے الفاظ کی تلاطم خیزیوں کے نیچے محبت کا ایک گہرا سمندر موجزن دیکھا ہے۔ اُنھیں افسوس تھا کہ اپنے جس دوست

کے بارے میں وہ اتنی اونچی رائے رکھتے تھے، وہ کس دلدل میں اتر گیا ہے۔ ۱۹۷۵ء میں، میں مولانا مودودی کے گھر کے بالکل سامنے مقیم تھا۔ وہ میرے ہاں تشریف لائے۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کے لیے صحن میں نکلے تو مجھ سے پوچھا: مولانا مودودی کا گھر یہی ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ میں نے دیکھا کہ وہ بار بار دہرا رہے تھے:

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

۱۸؍جنوری ۱۹۵۸ء کو یہ آشنائی امین احسن کے اِن الفاظ پر ختم ہوئی:

''میں جانتا ہوں کہ آپ کی رفاقت سے محروم ہو کر میں کیا کچھ کھو رہا ہوں، لیکن آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اگر آپ نے مجھ جیسے خیر خواہ مخلص کے مشوروں کی قدر نہیں کی تو آپ کو ''برے مشیروں'' کے مشورے ماننے پڑیں گے۔ میں دل سے متمنی تھا کہ مجھے آپ کی رفاقت حاصل رہے، لیکن آپ نے اپنے دونوں خطوں میں اُس کی جو قیمت مانگی ہے، میں وہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔''

مولانا دنیا سے رخصت ہوئے تو بڑے تاسف کے ساتھ فرمایا: آج وہ شخص دنیا سے چلا گیا جس سے اتفاق میں بھی لذت تھی اور اختلاف میں بھی۔ جس دن یہ سانحہ پیش آیا وہ میرے گھر میں تشریف فرما تھے، مولانا کی بذلہ سنجی کا ذکر ہوا تو پٹھان کوٹ کے زمانۂ قیام کے بعض دل چسپ واقعات سنائے۔ اُنھی میں ایک یہ لطیفہ بھی تھا۔ کہنے لگے: میری شادی ہوئی، چودھری عبدالرحمٰن صاحب، میرے خسر مجھ سے ملنے

کے لیے آئے ہوئے تھے۔ میں کسی وجہ سے اُس روز عصر کی نماز میں حاضر نہیں ہو سکا۔ مولانا سے کسی نے پوچھا: امین احسن نظر نہیں آئے؟ اُنھوں نے برجستہ جواب دیا: بھائی آج صبح سے وہ 'ان الانسان لفی خسر' میں مبتلا ہیں۔

بذلہ سنجی اور شوخی کلام میں امین احسن کا معاملہ بھی یہی تھا۔

قید کے زمانے میں مولانا مودودی کی بتیسی غالباً ٹوٹ گئی۔ امین احسن نہیں جانتے تھے کہ مولانا کے دانت مصنوعی ہیں۔ کسی نے بتایا تو دانتوں کی ''تعزیت'' کے لیے مولانا کے پاس گئے۔ بظاہر بہت افسردگی کی کیفیت میں تھوڑی دیر کے لیے کوٹھڑی کے دروازے میں کھڑے ہوئے، پھر کہا: مولانا، افسوس ہے، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کے کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے اور۔

ایک صاحب نے، جن سے دین کی خدمت کے معاملے میں وہ ایک زمانے میں اچھی توقعات رکھتے تھے، بڑے اہتمام کے ساتھ کانفرنسیں منعقد کرنا شروع کیں۔ اُن میں وہ تمام مکاتب فکر کے علما کو بلاتے اور اُن سے تقریریں کراتے تھے۔ دین کی خدمت کا جو تصور امین احسن رکھتے تھے، اُس میں ظاہر ہے اِس طرح کی چیزوں کی کوئی گنجایش نہ تھی۔ وہ صاحب اُنھیں بھی دعوت دینے آئے۔ امین احسن نے پوچھا: اِن کانفرنسوں سے آپ کا مقصد کیا ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ سب نقطہ ہاے نظر کے لوگ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوں۔ اُنھوں نے جواب دیا تو امین احسن نے بے ساختہ کہا: بھانت بھانت کے لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کی یہ خدمت تو ریلوے

پچھلے سو سال سے انجام دے رہی ہے۔ میرا خیال ہے، اِس کے لیے آپ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اِس معاملے میں بھی وہ صاحب طرز تھے۔ ایک بڑے عالم اور مصنف سے ناراض ہوئے تو اُن پر پڑھے کم، لکھے زیادہ کا فقرہ چست کیا۔ مستشرقین کے اسلوب تحقیق پر تنقید کی تو اِس کے لیے مکھی کو گھس گھس کر بھینس بنانے اور ٹڈے کی ٹانگ پر ہاتھی کا خول چڑھانے کے محاورے ایجاد کیے۔ فاطمہ جناح کی حمایت میں متحدہ محاذ بنا تو اُسے مینڈکوں کی پنسیری باندھنے سے تعبیر کیا۔ اِسی زمانے میں مولانا مودودی کا ایک جملہ بہت مشہور ہوا کہ ایک طرف ایک مرد ہے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں اور دوسری طرف ایک عورت ہے جس میں عورت ہونے کے سوا کوئی خرابی نہیں۔ امین احسن نے اِس پر تبصرہ کیا: تعجب ہے، اِن لوگوں میں کوئی ایک مرد بھی ایسا نہیں نکلا جو ایک ایسے مرد کا مقابلہ کر سکے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں ہے۔ ماچھی گوٹھ کے بعد کوٹ شیر سنگھ کی شوریٰ میں مولانا مودودی امیر جماعت کے لیے غیر معمولی اختیارات کا مطالبہ لے کر اٹھے۔ امین احسن کو اِس سے شدید اختلاف تھا۔ وہ ہمیشہ سے یہ رائے رکھتے تھے کہ ''جماعت'' کے امیر کو شوریٰ کے فیصلوں کا پابند ہونا چاہیے۔ چنانچہ اُنھوں نے جماعت سے استعفا دے دیا۔ اِس پر مولانا مودودی نے اُن کے نام ایک خط میں لکھا:

''میری اِس رائے کو آپ چاہیں تو غلط کہہ سکتے ہیں۔ اِس کے خلاف دلائل

دینے کی آپ کو پوری آزادی ہے، حتیٰ کہ آپ کو یہ بھی اختیار ہے کہ اِس کو جو بدتر سے بدتر معنی چاہیں پہنائیں، مگر آپ یہ الزام مجھ پر نہیں لگا سکتے کہ ایک بدنیتی کی بلی مدتوں سے مجرم ضمیر کے تھیلے میں چھپائے پھرتا رہا تھا اور پہلی مرتبہ اِسے موقع تاک کر کوٹ شیر سنگھ میں باہر نکال لایا۔ میں اِس رائے کو حق سمجھتا ہوں۔ ہمیشہ اِس کو ظاہر کیا ہے اور تشکیل ''جماعت'' کے بعد سے آج تک اِس پر عملاً کام کرتا رہا ہوں۔ آپ کو پورا حق ہے کہ اِسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اِس کی وجہ سے جماعت کو چھوڑنے کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ جماعت میں رہتے ہوئے آپ مجلس شوریٰ کے ذہن کو اِس سے مختلف جس رائے کے حق میں بھی ہموار کرنا چاہیں، پوری آزادی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔''

امین احسن نے اِس کا جواب دیا، اور دیکھیے کہ کیا جواب دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''آپ نے اپنی ''بلی'' کی تاریخ پیدایش ناحق بیان کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ میں اِس بات سے ناواقف نہیں ہوں کہ یہ بلی آپ کے تھیلے میں روز اول سے موجود ہے، لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ تقسیم سے پہلے الٰہ آباد کی شوریٰ کے اجلاس میں، میں نے اِس کا گلا دبانے کی کوشش کی۔ یاد نہ ہو تو مذکورہ شوریٰ کی روداد پڑھ لیجیے۔ اُس وقت تو یہ مر نہ سکی، لیکن میں اور جماعت کے دوسرے اہل نظر اِس کی فکر میں رہے اور شوریٰ میں اِس کی موت وحیات کا مسئلہ بار بار چھڑتا رہا، یہاں تک کہ تقسیم کے بعد ہم نے جو دستور بنایا، اُس میں اِس کی موت کا آخری فیصلہ ہو گیا۔ واضح رہے کہ جب اِس کے قتل کا فیصلہ ہوا تھا تو اُس وقت شرع شریف، مصلحت زمانہ اور اسلامی

جمہوریت، سب کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہوا تھا۔ اِس کی تائید میں علما کے فیصلے بھی حاصل کیے گئے تھے اور اہل نظر کی رائیں بھی جمع کی گئی تھیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ آپ اپنے عمل سے وقتاً فوقتاً اِس کو زندہ بھی کرتے رہے، لیکن ہمارے دستور نے اِس کی زندگی تسلیم نہیں کی۔ اِس سلسلہ میں جب کبھی آپ نے دستور کی مخالفت کی تو عموماً اپنے اقدامات میں بے بصیرتی کا ثبوت دیا جس سے جماعت کے اہل الرائے اِس بارے میں یک سو ہو گئے کہ یہ ''بلی'' مردہ ہی رہے تو اچھا ہے۔ لیکن آپ پر اِس کی موت بڑی شاق تھی۔ آپ اِس کو حیات تازہ بخشنے کے لیے برابر بے چین رہے۔ اِسی کے عشق میں آپ نے استعفا دیا۔ ماچھی گوٹھ میں آپ نے اِس کے لیے رازداروں کو خلوت میں بلا کر سازش کی۔ پھر کوٹ شیر سنگھ میں اِس پر مسیحائی کا آخری افسوں پڑھا اور یہ واقعی زندہ ہو گئی۔ اب آپ مجھے دعوت دیتے ہیں کہ میں پھر شوریٰ میں آؤں اور اُس کے اندر رہ کر اِس کو مارنے کی کوشش کروں تو میں اِس سے معافی چاہتا ہوں۔ ایک ''بلی'' برسوں کی محنت سے میں نے ماری، آپ نے وہ پھر زندہ کر دی اور اب آپ کی مجلس عاملہ نے اِس کی رضاعت و پرورش کی ذمہ داری بھی اٹھالی ہے۔ اب میں پھر اِس کو مارنے میں لگوں تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی ساری زندگی اِس ''گربہ کشی'' ہی کی نذر کر دوں۔ آخر یہ کون سا شریفانہ پیشہ ہے۔''

تجزیے اور محاکمے کے موقع پر اُن کا اسلوب یہی تھا۔ ''جائزہ کمیٹی'' پر الزامات کے جواب میں مولانا مودودی کو جو خط اُنھوں نے لکھا ہے، وہ اِس کا بہترین نمونہ ہے۔

شام کے سفیر کبیر نے اُسے پڑھا تو اُس پر اپنے قلم سے لکھ دیا: مولانا، آپ نے خط نہیں لکھا، قاضی کا فیصلہ لکھا ہے۔ ''جماعت اسلامی'' پر مولانا منظور احمد صاحب نعمانی کی فرد قرارداد جرم کے جواب میں بھی یہی اسلوب ہے۔ مولانا مودودی کے نظریۂ حکمت عملی کا تجزیہ بھی اِسی انداز سے ہوا ہے۔ عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرے میں بھی یہی لب و لہجہ ہے۔ اُن کی یہ تحریریں اُن کے طرز انشا کا ایسا نمونہ ہیں کہ آدمی پڑھتا ہے تو اُن کی شوخی طبیعت اور اُن کے سحر طراز قلم کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں نے اُن کا بڑھاپا دیکھا ہے۔ وہ لوگ جو ''جماعت اسلامی'' سے تعلق کے زمانے میں اُنھیں سنتے رہے ہیں، آج بھی اُن کی خطابت کو یاد کرتے ہیں۔ بعض سننے والوں نے بتایا ہے کہ وہ خطابت کیا تھی، معلوم ہوتا تھا کہ دریا میں ہلکا ہلکا تلاطم آ گیا ہے، پہاڑوں میں کوئی چشمہ ابل رہا ہے، کوئی ندی ہے جو فراز کوہ سے وادیوں میں اتر کر اب میدانوں کی طرف رواں دواں ہے۔ اُن کی زبان سے جو لفظ بھی نکلتا، سیدھا دل میں اتر جاتا تھا۔ وہ پیغمبرانہ اذعان کے ساتھ بولتے اور عہد عتیق کے خطیبوں کی یاد تازہ کر دیتے تھے۔ اُن کی زبان پر استدلال بولتا اور ایمان نازل ہوتا تھا۔ ۱۹۴۵ء میں اُن کی ایک تقریر کا جملہ اسی کیفیت کا آئینہ دار ہے کہ تم چاہو تو میری گردن پر تلوار رکھ دو، لیکن مجھ سے یہ بات کبھی نہ منوا سکو گے کہ تزکیۂ نفس جیسا پاکیزہ کام اُن جاہلوں کے سپرد کر دوں جو خانقاہوں میں بیٹھے دین فروشی کرتے ہیں۔ ایک نامور صحافی نے بتایا

کہ ککری گراؤنڈ کراچی میں وہ تقریر کر رہے تھے اور میں اُن کی یہ تقریر لکھ رہا تھا۔ تقریر کے دوران میں اُن کے منہ سے نکلا: ''اسلام فرماتا ہے۔'' وہ لمحے بھر کو رکے اور پھر یہ کہہ کر کہ اِسے غلط نہ سمجھیے، فرمانے کا حق اگر ہے تو صرف اسلام ہی کو ہے، لفظ و معنی کا وہ بحرِ مواج پیدا کر دیا کہ میں دیکھتا رہا، سنتا رہا اور یہ بھول گیا کہ مجھے یہ سب کچھ لکھنا بھی ہے۔

دین کی دعوت وہ ہمیشہ اِسی اذعان اور ایمان کی اِسی حرارت کے ساتھ دیتے تھے۔

اِس باب میں ایک لطیفہ بھی ہوا۔ ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں ''جماعت اسلامی'' نے اُنھیں الیکشن لڑنے کے لیے کھڑا کر دیا۔ وہ بتاتے تھے کہ میں نے بہت کہا کہ اِس کام کے لیے مجھ سے زیادہ ناموزوں آدمی کسی ماں نے نہیں جنا، لیکن ''امیر المومنین''، نہیں مانے۔ طوعاً و کرہاً میں راضی ہوا تو ایک دن مجھ سے کہا گیا: حلقہ میں تقریر بھی کرنا ہوگی۔ میں گیا تو اپنی تقریر کی ابتدا میں نے یہاں سے کی کہ خواتین و حضرات، مجھ پر خدا کی اور اُس کے فرشتوں اور اہل ایمان، سب کی لعنت ہو اگر میں آپ سے ووٹ مانگنے کے لیے آیا ہوں۔ میں تو آپ کو یہ بتانے کے لیے آیا ہوں کہ ووٹر کی حیثیت سے آپ کے فرائض کیا ہیں۔ اِس کے بعد، ظاہر ہے کہ وہ مجھے اِس الیکشن میں کسی تقریر کے لیے بلانے کی حماقت نہیں کر سکتے تھے۔

اُن کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اِسی جماعت میں گزرا۔ وہ برسوں اِس کی دعوت کے

نقیب رہے۔ اِس پس منظر میں یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ جماعت جس فکر پر قائم ہے، زندگی کے اِس آخری دور میں اُس کے متعلق اُن کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ میں نے جو کچھ اُن سے سنا اور جو کچھ سمجھا ہے، اُس کی بنیاد پر میں پوری ذمہ داری سے کہتا ہوں کہ اب نہ وہ اقامت دین کے اُس مفہوم کے قائل تھے جو جماعت اِس سے مراد لیتی ہے، نہ اظہار دین کے وہ معنی اُن کے نزدیک درست تھے جو مولانا مودودی نے بیان کیے ہیں، نہ ''جماعت اسلامی'' قسم کی جماعتیں بنانے کو وہ صحیح سمجھتے تھے، نہ حکومت کے بغیر جہاد اور امارت اور بیعت سمع وطاعت جیسی لغویات کے لیے اُن کے فکر میں کوئی گنجایش تھی، نہ اقتدار کی سیاست کو وہ علما کے لیے موزوں خیال کرتے تھے۔ اُن کی پختہ رائے اب یہی تھی کہ علما کی ہر جدوجہد کا ہدف صرف ذہنی اور فکری انقلاب ہونا چاہیے۔ عالم جب تک عالم ہے اور عالم رہنا چاہتا ہے، اِس سے آگے اُسے ہرگز کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سب باتیں اِس آخری زمانے میں اُن کی تقریروں، تحریروں اور گفتگوؤں میں بڑی صراحت کے ساتھ کہی گئی ہیں۔ اِن میں سے ایک ایک چیز کے بارے میں خود اُن کے الفاظ کی شہادت پیش کی جاسکتی ہے۔

امین احسن کی اقلیم فکر کیا ہے؟ جن لوگوں نے بھی اِس کی سیر کے لیے کچھ فرصت پائی ہے، وہ جانتے ہیں کہ مذہبیات کی دنیا میں یہ ایک بالکل نئی اقلیم ہے۔ اِس میں ساری حکومت، سارا اقتدار قرآن کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کی زبان سے جو لفظ بھی نکلتا

ہے، قانون بن جاتا ہے۔ ہر جگہ اُس نے ایک میزان نصب کر رکھی ہے۔ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید وشبلی، سب اپنی اپنی چیزیں لاتے اور اِس میزان میں تولتے ہیں۔ پھر جس کی کوئی چیز ذرا بھی وزن میں کم ہو، اِس اقلیم میں وہ اُسے کہیں بیچ نہیں سکتا۔ علم و دانش، فلسفہ وحکمت، سب قرآن کے حضور میں دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ اُس کا ہر لفظ ایک شہر عجائب ہے اور یہ عجائب کبھی ختم نہیں ہوتے۔ وہ پہلے محکم بولتا اور پھر اُس کی تفصیل کر دیتا ہے۔ اُس کی باتوں کو سمجھنے میں کوئی مشکل پیش آ جائے تو خود اُسی کی دوسری باتیں وضاحت کر دیتی ہیں۔ اُس کا ایک ایوان خاص ہے جس کے بام و در پر ہر جگہ جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے کہ جو ہماری باتوں میں نظم و ترتیب کو نہیں مانتا، وہ ہمارے اِس ایوان میں داخل نہیں ہوسکتا۔ امین احسن کی ساری زندگی اِسی اقلیم میں بسر ہوئی ہے:

اُس کا انداز نظر اپنے زمانے سے جدا
اُس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

تاہم ''پیران طریق'' میں بھی کبھی کوئی محرم مل ہی جاتا تھا۔ مولانا منظور احمد صاحب نعمانی لاہور آئے تو امین احسن نے اُنھیں بتایا: میری اہلیہ کہتی ہیں کہ تمھاری کتابیں تو میری سمجھ میں نہیں آتیں، لیکن مولانا نعمانی کی کتابیں میں خوب سمجھ لیتی ہوں۔ مولانا نعمانی نے فوراً کہا: مولانا ہم اُن کے لیے لکھتے ہیں اور آپ ہمارے لیے لکھتے ہیں۔

''تدبر قرآن'' مکمل ہوئی تو مولانا نعمانی نے اپنا ایک خواب بیان کیا کہ وہ امین احسن کے ہاں آئے ہیں، وہاں مزعفر کی ایک دیگ پکی ہوئی ہے جس سے خوش بو کی لپٹیں آ رہی ہیں۔ مولانا نعمانی نے لکھا کہ وہ اِسے ''تدبر قرآن'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

امین احسن کو اللہ تعالیٰ نے خوب صورت سراپا دیا تھا، خوش ذوق اور خوش لباس بھی تھے، لیکن اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے میں ہمیشہ بہت سادہ رہے۔ اُن کے ایک پرانے ساتھی نے بتایا کہ ''جماعت'' کی طرف سے اُنھیں میانوالی بھیجا گیا۔ میں اُن کا رفیق سفر تھا۔ ہم بس کے ذریعے سے جا رہے تھے۔ سرگودھا کے اڈے پر بس رکی تو اُنھوں نے مجھ سے کہا: گھی سمجھ کر تیل کھانے سے بہتر ہے کہ تیل سمجھ کر تیل ہی کھایا جائے، جاؤ ایک نان اور کچھ پکوڑے لے آؤ۔

وہ فرشتہ نہیں، انسان ہی تھے اور اُن میں کچھ کمزوریاں بھی تھیں، لیکن معیار زندگی بڑھانے کا کوئی فتنہ کبھی اُن کے قریب سے نہیں گزرا۔ اللہ تعالیٰ سے تفویض و توکل کا ایسا تعلق تھا کہ اُس پر رشک آتا تھا۔ زبان اکثر ذکر الٰہی سے تر رہتی۔ مولانا عبدالرحیم اشرف سفر حج میں اُن کے ساتھ تھے، اُنھوں نے ایک مرتبہ بتایا کہ وہاں پہنچ کر اُن کی ساری دل چسپی صرف بیت اللہ کے ساتھ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز سے بالکل بے تعلق ہو گئے ہیں۔ زندگی کے سرد و گرم میں ہمیشہ اپنے پروردگار کی رضا پر مطمئن رہے۔ حادثۂ قاہرہ میں ابوصالح جیسے فرزند کی وفات پر ''میثاق'' میں جو کچھ لکھا ہے، اُس سے

اُن کے جذبات کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اِس موقع پر جزع فزع کا کوئی کلمہ اُن کی زبان سے نہیں نکلا۔ آخری دو سال اُنھوں نے جس معذوری اور بے بسی کی حالت میں بستر پر گزارے ہیں، اُس کی تکلیف جھیلنا آسان نہ تھا، لیکن اِس میں بھی اگر کچھ کہا تو یہی کہا کہ آخرت کی تکلیف نہ ہو تو دنیا کی کوئی تکلیف بھی تکلیف نہیں ہے۔

طبیعت میں بڑی غیرت، بڑا وقار، بڑی تمکنت اور بڑی بے نیازی تھی۔ ایوب خان صاحب نے پوچھا: مولانا، کوئی خدمت بتایئے۔ اُن کا جواب تھا: آپ سے جو کچھ کہنا ہوتا ہے، ''میثاق'' کے اداریوں میں کہہ دیتا ہوں، اُس پر عمل کیجیے، یہی سب سے بڑی خدمت ہے۔ بھٹو صاحب نے پیغام بھیجا کہ حکومت آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ جواب دیا: میں حکومت کے وظیفہ خواروں کو ہمیشہ ملت فروش کہتا رہا ہوں۔ کیا اب خود بھی یہی کام کروں گا؟ ضیاء الحق صاحب کی طرف سے سلسلہ جنبانی ہوئی، لیکن اگر کچھ کہا تو صرف یہی کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، اُسے اپنی لائبریریوں تک پہنچایئے، یہی کافی ہے۔ اُن کی ہر ادا میں یہ صدا تھی:

مگذر از نغمۂ شوقم کہ بیابی دروے
رمز درویشی و سرمایۂ شاہنشاہی

دوستوں کے لیے، البتہ طبیعت میں بڑی تواضع اور بڑی شفقت تھی۔ جن دنوں رحمٰن آباد میں تھے، میں ایک مرتبہ ملنے کے لیے گیا تو رات وہیں ٹھیرا۔ فجر سے کچھ

پہلے میں نے محسوس کیا کہ ذرا دور کوئی ہاتھ کے نل سے پانی کی بالٹی بھرتا اور پھر اُسے انڈیل دیتا ہے۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ امین احسن ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ میری چارپائی کے پاس آئے اور فرمایا: میں نے تازہ پانی نکال دیا ہے، اٹھیے اور وضو کر لیجیے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہوں اور کیا کروں۔

وہ اتنے سچے، اتنے بے لاگ اور اتنے دوٹوک تھے کہ مصلحت اندیشی کے پیمانے سے اُسے خطرناک سمجھا جائے گا۔ جو کچھ کہنا چاہتے، بغیر کسی تردد کے کہہ دیتے۔ اپنے رفقا میں فکر وعمل کا کوئی تضاد کسی حال میں برداشت نہ کرتے۔ اُن کی محبت بے پناہ تھی، مگر اخلاص کی گہرائی سے جس طرح یہ محبت چشمہ بن کر پھوٹتی تھی، اِسی طرح رنج بھی ابل پڑتا تھا۔ تاہم دیکھنے والے دیکھتے کہ اِس میں کسی بغض، کسی کینے اور کسی دشمنی کا کوئی شائبہ نہ ہوتا۔ گویا وہی معاملہ تھا کہ:

قہر بھی اُس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق

اُن کی باتیں کہاں تک لکھوں؟ آج اُن کا مرقع کھینچ رہا ہوں تو اپنے عجز بیان کو دیکھ کر بار بار خیال ہوتا ہے کہ امین احسن سے کم وبیش پچیس سال تک ملاقات اور تلمذ کا جو شرف مجھے حاصل رہا ہے، اے کاش، کسی ایسے شخص کو بھی حاصل ہوتا جسے زبان وبیان پر امین احسن ہی کی طرح قدرت ہوتی۔ یہ زمانے کی بدقسمتی ہے کہ اِس نابغۂ روزگار کو جاننے کے لیے اُسے مجھ جیسا شکستہ قلم ہی میسر ہو سکا جس کا حال یہ ہے کہ:

در زباں حرف نماندہ ست وسخنہا ماندہ ست

وہ صرف دین ہی کے عالم نہ تھے، دستور وقانون اور سیاست دوراں کے مسائل پر بھی اُن کی نظر اتنی گہری تھی کہ اِن کے ماہرین اُن کی صحبت میں بیٹھ کر بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔ اِن چیزوں کو دیکھنے کا اُن کا اپنا ایک انداز تھا جو اہل زمانہ سے بہت کچھ مختلف تھا۔ بھٹو صاحب کو پھانسی کی سزا ہوئی تو مذہبی حلقوں میں بالعموم اطمینان کا اظہار کیا گیا۔ اِس سے اگلے روز میں رحمٰن آباد حاضر ہوا تو امین احسن کو افسردہ دیکھا۔ میں نے پوچھا تو کچھ دیر کے لیے خاموش رہے، پھر فرمایا: مجھے بھٹو صاحب سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے، لیکن جن احمقوں نے ایک قومی رہنما کو ختم کر دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا ہے، وہ نہیں جانتے کہ اِس طرح اُنھوں نے اِس ملک کی سیاست میں ایک مستقل عناد کی بنیاد رکھ دی ہے۔ افغانستان میں جو کچھ ہوا، اُس کے مضمرات اُنھوں نے جس طرح ابتدا ہی میں سمجھ لیے تھے، اُسے آج لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ الجزائر، ترکی اور مصر و شام میں اسلامی تحریکوں کے معاملات کو وہ جس نظر سے دیکھتے تھے، ہمارے مذہبی رہنما شاید اُس وقت دیکھیں گے، جب بہت کچھ ڈوب چکا ہو گا۔ جماعت اسلامی سے اُن کی علیحدگی جس موقف کی بنیاد پر ہوئی، وہ اب اپنی صحت کے لیے کسی بحث و استدلال کا محتاج نہیں رہا۔ اِس کی اصابت خود اُن لوگوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دی ہے جو اِس وقت مولانا مودودی کے مشیروں میں اُن کے سب سے بڑے مخالف تھے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے کانوں سے سن لیا ہے کہ اپنے امیر سے وہ آج وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو آج سے برسوں پہلے امین

احسن نے اُن کے ''امیر المومنین'' سے کہا تھا۔

وہ ایک زندہ انسان تھے اور زندگی کے مسائل کو ایک زندہ اور بیدار انسان جس طرح دیکھتا ہے، اُسی طرح دیکھتے تھے۔ علم و عمل کے جس مرتبے پر وہ فائز تھے، وہاں کھیل تماشے کا کیا گزر؟ لیکن ملک سے اُن کی محبت کا یہ عالم تھا کہ پاکستان اور بھارت اگر کبھی میدان میں اترتے تو بار بار پوچھتے اور اُس وقت تک مطمئن نہ ہوتے، جب تک پاکستان کی فتح کا یقین نہ ہو جاتا۔ غالب، اقبال اور شبلی کے بڑے مداح تھے۔ اُن کے اشعار اکثر پڑھتے۔ طبیعت میں شگفتگی تھی، اپنی بیماری کا ذکر بھی کرتے تو لب ولہجہ ایسا ہوتا کہ چہروں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ مذہبی حماقتوں پر اُن کی خاص نظر رہتی تھی، یہ ذکر چھڑ جاتا تو اُن کی گل افشانی گفتار کا عالم دیکھنے کی چیز ہوتا۔ لفظ لفظ میں تلمیح و تعریض سے وہ مضمون پیدا کرتے کہ سننے والا صاحب ذوق ہوتا تو اش اش کر اٹھتا۔ اُن کے پرانے دوستوں میں سے ایک مذہبی رہنما سے اِسی طرح کی بعض باتیں سرزد ہوئیں تو اُن پر تبصرے کے لیے ایسے خوب صورت اسالیب ایجاد کیے کہ خوف فساد خلق نہ ہوتا تو میں سناتا اور لوگ دیکھتے کہ امین احسن کو قدرت نے لفظ و معنی کو رشتہ بپا کرنے کی کیا صلاحیت بخشی تھی اور کس کمال سے نوازا تھا۔ وہ دنیا سے کیا گئے، حقیقت یہ ہے کہ:

خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

حالی غالب کے شاگرد تھے۔ اُن کے مرثیے کا اختتام اُنھوں نے جن شعروں پر کیا

ہے، اُنھیں لوگوں نے اُس زمانے میں حالی کے حسن عقیدت پر محمول کیا ہوگا۔ لیکن وقت نے ثابت کر دیا کہ غالب وہی تھا، جسے حالی کی آنکھوں نے دیکھا۔ میں نے بھی بہت عالم دیکھے، بہتوں کو پڑھا اور بہتوں کو سنا ہے، لیکن امین احسن اور اُن کے استاذ حمید الدین فراہی کا معاملہ وہی ہے کہ:

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت!
خاک کو آسماں سے کیا نسبت!

[۱۹۹۷ء]

www.ghamidi.net

www.ghamidi.net

www.ghamidi.net

دین و دانش

www.ghamidi.net

ایمان بالغیب

ایمان بالغیب کے معنی یہ ہیں کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے، اُنھیں انسان محض عقلی دلائل کی بنا پر مان لے۔ ذات خداوندی کو ہم دیکھ نہیں سکتے؛ قیامت ابھی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی ہے؛ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جبریل امین کو وحی کرتے ہم نے نہیں دیکھا، لیکن اِس کے باوجود ہم اِن سب باتوں کو مانتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن حقائق کو ماننے کے لیے انفس و آفاق میں اور خود اُس کلام میں جو اللہ کے پیغمبر نے پیش کیا، ایسے قوی دلائل موجود ہیں جن کا انکار کوئی صاحب عقل نہیں کر سکتا۔

چنانچہ ہم اِنھیں بے سوچے سمجھے نہیں مانتے، بن دیکھے مانتے ہیں۔ وہ چیز جو دیکھی نہیں جا سکتی، لیکن عقل کے ذریعے سے سمجھی جا سکتی ہے، اُسے دیکھنے کا تقاضا ہی سب سے بڑی بے عقلی ہے۔ کتنی حقیقتیں اِس زمانے میں سائنس نے دریافت کی ہیں جنھیں ہم اپنے حواس کی گرفت میں نہیں لے سکتے، لیکن اِس کے باوجود اِسی طرح مانتے ہیں،

جس طرح دوپہر چڑھے کھلے آسمان کے نیچے اِس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ سورج چمک رہا ہے اور اِس کی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔

قرآن نے جو حقائق پیش کیے ہیں، اُن پر ہمارے ایمان کی بنیاد بھی یہی ہے۔ وہ، بے شک حواس سے ماورا ہیں، لیکن عقل سے ماورا نہیں ہیں۔ ہم نے اُنھیں عقل کی میزان میں تولا ہے اور اُن میں رتی بھر کمی نہیں پائی۔ چنانچہ ہم اُن پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُنھیں عقل وفطرت کے قطعی دلائل کی بنا پر مانتے ہیں۔ اِس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد ہی مانیں گے۔

[۱۹۸۷ء]

اسلامی تہذیب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد جو تہذیب دنیا میں پیدا ہوئی، اُس کی بنیادی قدر عبودیت تھی۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ معاشرہ خدا پر ایمان اور اُس کے ساتھ بندگی کے تعلق کو محور ومرکز کی حیثیت دیتا اور زندگی کے تمام معاملات کو اِسی محور سے متعلق کرتا ہے۔ آزادی اُس میں بھی ایک بڑی قدر تھی، لیکن وہ بندگی سے آزاد نہیں تھی۔ اِس تہذیب کے اخلاقی تصورات میں کوئی ابہام نہ تھا۔ وہ خدا کے الہام سے تصویب حاصل

کرتے تھے۔ اِس کے شاعر، ادیب، فلسفی، حکیم، سائنس دان اور ارباب سیاست، سب اِس معاملے میں بالکل واضح تھے اور اپنے نتائج فکر بالعموم اِسی حوالے سے پیش کرتے تھے۔ چنانچہ اِس سے جو تہذیبی روایت قائم ہوئی اور کم وبیش ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے اجتماعی وجود کا احاطہ کیے رہی، اُس کے عناصر یہ تین تھے:

ایک حفظ فروج،

دوسرے حفظ مراتب،

تیسرے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

حفظ فروج کے معنی یہ تھے کہ لوگوں کو اِس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ معاشرے میں بدکاری کو عام کریں، مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے علانیہ جنسی تعلقات پیدا کریں، اِسی تعلق کی بنا پر اکٹھے رہیں یا جنسی اعضا اور جنسی معاملات دوسروں کے سامنے کھولیں۔

حفظ مراتب کے معنی یہ تھے کہ خلقت کے لحاظ سے تمام انسان، بے شک برابر ہیں، مگر رشتوں میں برابری نہیں ہے۔ چھوٹوں کے لیے بڑے، اولاد کے لیے والدین، شاگردوں کے لیے استاد اور بیوی کے لیے شوہر برتری کے مقام پر ہیں۔ اِن کے لیے تادیب وتنبیہ کا حق مانا جائے گا اور اِن کی عزت اور ان کا احترام ہر حال میں قائم رکھا جائے گا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے معنی یہ تھے کہ معاشرہ خیر وشر کے مسلمات سے

بے تعلق نہیں رہے گا۔ انسانی فطرت میں جو چیزیں خیر کی حیثیت سے پہچانی جاتی ہیں اور جنھیں پوری انسانیت مانتی ہے اور جن چیزوں کو فطرت شر سمجھتی اور پوری انسانیت جن سے نفرت کرتی ہے، اُن سے لوگوں کو ہر حال میں روکا جائے گا۔

یہ تہذیبی روایت انسانیت کا حسن اور اُس کے چہرے کا جمال تھی۔ اِس کا زوال انسانیت کا زوال ہے۔ انسانی حقوق، جمہوریت اور قانون کی حکمرانی کے لیے دور جدید کا انسان جتنا حساس ہے، اے کاش وہ اِس روایت کی بازیافت کے لیے بھی اتنا ہی حساس ہو جائے۔

[۲۰۰۸ء]

حلال وحرام

زینت کا لفظ عربی زبان میں اُن چیزوں کے لیے آتا ہے جن سے انسان اپنی حس جمالیات کی تسکین کے لیے کسی چیز کو سجاتا بناتا ہے۔ چنانچہ لباس، زیورات وغیرہ بدن کی زینت ہیں؛ پردے، صوفے، قالین، غالیچے، تماثیل، تصویریں اور دوسرا فرنیچر گھروں کی زینت ہے؛ باغات، عمارتیں اور اِس نوعیت کی دوسری چیزیں شہروں کی زینت ہیں، موسیقی آواز کی زینت ہے؛ شاعری کلام کی زینت ہے۔ دین کی صوفیانہ

تعبیر اور صوفیانہ مذاہب تو اِن سب چیزوں کو مایا کا جال سمجھتے اور بالعموم حرام یا مکروہ یا قابل ترک اور ارتقاے روحانی میں سدراہ قرار دیتے ہیں، مگر قرآن کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے۔ وہ اِن مذاہب کی تردید کرتا اور پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ سب چیزیں جائز ہیں، بلکہ نہایت سخت تنبیہ اور تہدید کے انداز میں پوچھتا ہے کہ کون ہے جو زینت کی اِن چیزوں کو حرام قرار دینے کی جسارت کرتا ہے جو خدا نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں:

قُلْ، مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ. (الاعراف ۷:۳۲)

''اِن سے کہو، اللہ کی اُس زینت کو کس نے حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا ہے اور کھانے کی پاک چیزیں کس نے ممنوع ٹھیرا دی ہیں۔''

پھر یہی نہیں، وہ اعلان کرتا ہے کہ رزق کے طیبات اور زینت کی یہ سب چیزیں تو اِس دنیا میں پیدا ہی اہل ایمان کے لیے کی گئی ہیں، لہٰذا اصلاً اُنھی کا حق ہیں۔ خدا کے منکروں کو تو یہ اُن کی طفیل اور اُس مہلت کی وجہ سے ملتی ہیں جو دنیا کی آزمایش کے لیے اُنھیں دی گئی ہے۔ چنانچہ آخرت میں یہ تمام تر اہل ایمان کے لیے خاص ہوں گی، منکروں کے لیے اِن میں کوئی حصہ نہیں ہوگا، وہ اِن سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے جائیں گے:

قُلْ، هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا خَالِصَۃً یَّوْمَ الْقِیٰمَۃِ، کَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ. (الاعراف ۷:۳۲)

''یہ دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصتاً اُنھی کے لیے ہوں گی۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو جاننا چاہیں اپنی آیتوں کی اِسی طرح تفصیل کرتے ہیں۔''

قرآن کا یہ اعلان ایک حیرت انگیز اعلان ہے۔ عام مذہبی تصورات اور صوفیانہ مذاہب کی تعلیمات کے برخلاف قرآن دینی زندگی کا ایک بالکل ہی دوسرا تصور پیش کرتا ہے۔ تقرب الٰہی اور وصول الی اللہ کے لیے دنیا کی زینتوں سے دست برداری کی تلقین کے بجاے وہ ایمان والوں کو ترغیب دیتا ہے کہ اسراف وتبذیر سے بچ کر اور حدود الٰہی کے اندر وہ زینت کی سب چیزیں بغیر کسی تردد کے استعمال کریں اور خدا کی اِن نعمتوں پر اُس کا شکر بجالائیں:

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ، خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ، وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا، اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ. (الاعراف ۷:۳۱)

''آدم کے بیٹو، ہر مسجد کی حاضری کے وقت اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو، مگر اسراف نہ کرو، اِس لیے کہ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اِس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی شریعت میں حرام پھر کیا چیزیں ہیں؟

اِس سوال کا جواب قرآن نے سورۂ اعراف میں آگے اِسی مقام پر یہ دیا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اللہ نے صرف پانچ چیزیں حرام قرار دی ہیں: ایک فواحش، دوسرے حق تلفی، تیسرے ناحق زیادتی، چوتھے شرک اور پانچویں بدعت۔

خدا کی شریعت میں یہی پانچ چیزیں حرام ہیں۔ اِن کے علاوہ کوئی چیز حرام نہیں ہے۔ حلال وحرام کے معاملے میں یہ خدا کا اعلان ہے، لہٰذا کسی کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اِن کے علاوہ کسی چیز کو حرام ٹھیرائے۔ چنانچہ اب اگر کوئی چیز حرام ہوگی تو اُسی وقت ہوگی، جب اِن میں سے کوئی چیز اُس میں پائی جائے گی۔ روایتیں، آثار، حدیثیں اور پچھلے صحیفوں کے بیانات، سب قرآن کے اِسی ارشاد کی روشنی میں سمجھے جائیں گے۔ اِس سے ہٹ کر یا اِس کے خلاف کوئی چیز بھی قابل قبول نہ ہوگی۔ فرمایا ہے:

قُلْ، اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ، وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا، وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ. (الاعراف ۷:۳۳)

''اِن سے کہہ دو کہ میرے رب نے تو صرف فواحش کو حرام کیا ہے خواہ کھلے ہوں یا چھپے اور حق تلفی اور ناحق زیادتی کو حرام کیا ہے اور اِس کو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیراؤ جس کے لیے اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے اور اِس کو کہ تم اللہ پر افترا کر کے کوئی ایسی بات کہو جسے تم نہیں جانتے۔''

حدیث وسنت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو قرآن دیا ہے۔ اِس کے علاوہ جو چیزیں آپ نے دین کی حیثیت سے دنیا کو دی ہیں، وہ بنیادی طور پر تین ہی ہیں:

۱۔ مستقل بالذات احکام وہدایات جن کی ابتدا قرآن سے نہیں ہوئی۔

۲۔ مستقل بالذات احکام وہدایات کی شرح ووضاحت، خواہ وہ قرآن میں ہوں یا قرآن سے باہر۔

۳۔ اِن احکام وہدایات پر عمل کا نمونہ۔

یہ تینوں چیزیں دین ہیں۔ دین کی حیثیت سے ہر مسلمان اِنھیں ماننے اور اِن پر عمل کرنے کا پابند ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اِن کی نسبت کے بارے میں مطمئن ہو جانے کے بعد کوئی صاحب ایمان اِن سے انحراف کی جسارت نہیں کر سکتا۔ اُس کے لیے زیبا یہی ہے کہ وہ اگر مسلمان کی حیثیت سے جینا اور مرنا چاہتا ہے تو بغیر کسی تردد کے اِن کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔

ہمارے علما اِن تینوں کے لیے ایک ہی لفظ ''سنت'' استعمال کرتے ہیں۔ میں اِسے موزوں نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک پہلی چیز کے لیے ''سنت''، دوسری کے لیے

''تفہیم وتبیین'' اور تیسری کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' کی اصطلاح استعمال کرنی چاہیے۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ اصل اور فرع کو ایک ہی عنوان کے تحت اور ایک ہی درجے میں رکھ دینے سے جو خلط مبحث پیدا ہوتا ہے، اُسے دور کر دیا جائے۔

یہ محض اصطلاحات کا اختلاف ہے، ورنہ حقیقت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو میرے اور ائمۂ سلف کے موقف میں سرمو کوئی فرق نہیں ہے۔ میرے ناقدین اگر میری کتاب ''میزان'' کا مطالعہ دقت نظر کے ساتھ کرتے تو اِس چیز کو سمجھ لیتے اور اُنھیں کوئی غلط فہمی نہ ہوتی۔ یہ توقع اب بھی نہیں ہے۔ دین کے سنجیدہ طالب علم، البتہ مستحق ہیں کہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے یہ چند معروضات اُن کی خدمت میں پیش کر دی جائیں۔

اولاً، سنت کے ذریعے سے جو دین ملا ہے، اُس کا ایک بڑا حصہ دین ابراہیمی کی تجدید واصلاح پر مشتمل ہے۔ تمام محققین یہی مانتے ہیں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس میں محض جزوی اضافے کیے ہیں۔ ہرگز نہیں، آپ نے اِس میں مستقل بالذات احکام کا اضافہ بھی کیا ہے۔ اِس کی مثالیں کوئی شخص اگر چاہے تو ''میزان'' میں دیکھ لے سکتا ہے۔ یہی معاملہ قرآن کا ہے۔ دین کے جن احکام کی ابتدا اُس سے ہوئی ہے، اُن کی تفصیلات ''میزان'' کے کم وبیش تین سو صفحات میں بیان ہوئی ہیں۔ میں اِن میں سے ایک ایک چیز کو ماننے اور اُس پر عمل کرنے کو ایمان کا تقاضا سمجھتا ہوں، اِس لیے یہ الزام بالکل لغو ہے کہ پہلے سے موجود اور متعارف

چیزوں سے ہٹ کر کوئی نیا حکم دینا یا دین میں کسی نئی بات کا اضافہ کرنا میرے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا قرآن مجید کے دائرۂ کار میں شامل ہی نہیں ہے۔

ثانیاً، سنت کی تعیین کے ضوابط کیا ہیں؟ اِن کی وضاحت کے لیے میں نے ''میزان'' کے مقدمہ ''اصول ومبادی'' میں ''مبادی تدبر سنت'' کے عنوان سے ایک پورا باب لکھا ہے۔ یہ سات اصول ہیں۔ اِن کی بنیاد پر ہر صاحب علم کسی چیز کے سنت ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ سنن کی ایک فہرست اِنھی اصولوں کے مطابق میں نے مرتب کردی ہے۔ اِس میں کمی بھی ہوسکتی ہے اور بیشی بھی۔ تحقیق کی غلطی واضح ہوجانے کے بعد میں خود بھی وقتاً فوقتاً اِس میں کمی بیشی کرتا رہا ہوں۔ میں نے کبھی اِس امکان کو رد نہیں کیا ہے۔

ثالثاً، اِس فہرست سے ہٹ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات بھی دین کی حیثیت سے روایتوں میں نقل ہوئے ہیں، اُن میں سے بعض کو میں نے ''تفہیم وتبیین'' اور بعض کو ''اسوۂ حسنہ'' کے ذیل میں رکھا ہے۔ یہی معاملہ عقائد کی تعبیر کا ہے۔ اِس سلسلہ کی جو چیزیں روایتوں میں آئی ہیں، وہ سب میری کتاب ''میزان'' کے باب ایمانیات میں دیکھ لی جاسکتی ہیں۔ یہ بھی ''تفہیم وتبیین'' ہے۔ علمی نوعیت کی جو چیزیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے نقل ہوئی ہیں، اُن کے لیے صحیح لفظ میرے نزدیک یہی ہے۔ آپ سے نسبت متحقق ہو تو اس نوعیت کے ہر حکم، ہر فیصلے اور ہر تعبیر کو میں حجت سمجھتا ہوں۔ اِس سے ادنیٰ اختلاف بھی میرے نزدیک ایمان کے منافی ہے۔

جہاد وقتال

جہاد کے معنی کسی جدوجہد میں پوری قوت صرف کر دینے کے ہیں۔ قرآن میں یہ تعبیر جس طرح اللہ کی راہ میں عام جدوجہد کے لیے آئی ہے، اسی طرح قتال فی سبیل اللہ یا اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے بھی آئی ہے۔ اِس کی دو صورتیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں:

ایک کفر کے خلاف جنگ،

دوسرے ظلم وعدوان کے خلاف جنگ۔

پہلی صورت کا تعلق شریعت سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قانون اتمام حجت سے ہے جو اِس دنیا میں ہمیشہ اُس کے براہ راست حکم سے اور اُنھی ہستیوں کے ذریعے سے روبہ عمل ہوتا ہے جنھیں وہ رسالت کے منصب پر فائز کرتا ہے۔ انسانی تاریخ میں یہ منصب آخری مرتبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہوا ہے۔ اِس قانون کے تحت آپ نے اور آپ کے صحابہ نے کفر کے خلاف جو جنگیں لڑی ہیں، وہ محض جنگیں نہ تھیں، بلکہ خدا کا عذاب تھا جو سنت الٰہی کے عین مطابق اور ایک فیصلۂ خداوندی کی حیثیت سے پہلے عرب کے مشرکین اور یہود و نصاریٰ پر اور اِس کے بعد جزیرہ نماے عرب سے باہر کی بعض قوموں پر نازل کیا گیا۔ آپ پر نبوت ختم کر دی گئی ہے۔ چنانچہ لوگوں کے

خلاف محض اُن کے کفر کی وجہ سے جنگ اور اِس کے نتیجے میں مفتوحین کو قتل کرنے یا اُن پر جزیہ عائد کر کے اُنھیں محکوم اور زیردست بنا کر رکھنے کا حق بھی آپ اور آپ کے صحابہ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔ قیامت تک کوئی شخص اب نہ دنیا کی کسی قوم پر اِس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے اور نہ کسی مفتوح کو محکوم بنا کر اُس پر جزیہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے۔

دوسری صورت، البتہ شریعت کا حکم ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے جہاد وقتال کی ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے اور وہ ظلم و عدوان کے خلاف جنگ ہے۔ اسلامی شریعت میں جہاد اِسی مقصد سے کیا جاتا ہے۔ یہ نہ خواہش نفس کے لیے ہے، نہ مال و دولت کے لیے، نہ ملک کی تسخیر اور زمین کی حکومت کے لیے، نہ شہرت و ناموری کے لیے اور نہ حمیت وحمایت اور عصبیت یا عداوت کے کسی جذبے کی تسکین کے لیے۔ انسان کی خودغرضی اور نفسانیت کا اِس جہاد وقتال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ اللہ کی جنگ ہے جو اُس کے بندے، اُس کے حکم پر اور اُس کی ہدایت کے مطابق اُس کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اُن کی حیثیت اِس جنگ میں محض آلات و جوارح کی ہے۔ اِس میں اُنھیں اپنا کوئی مقصد نہیں، بلکہ خدا کے مقاصد پورے کرنا ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ اپنی اِس حیثیت سے سرمو کوئی انحراف نہیں کر سکتے۔

اِس کا جو قانون قرآن میں بیان ہوا ہے، اُس کی اہم دفعات یہ ہیں:

۱۔ جہاد وقتال کا حکم مسلمانوں کو بحیثیت جماعت دیا گیا ہے۔ اِس کی جو آیتیں بھی

قرآن میں آئی ہیں، مسلمان اپنی انفرادی حیثیت میں اُن کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ حدود وتعزیرات کی طرح اِن آیات کے مخاطب وہ بحیثیت جماعت ہیں۔ لہٰذا اِس معاملے میں کسی اقدام کا حق بھی اُن کے نظم اجتماعی کو حاصل ہے۔ اُن کے اندر کا کوئی فرد یا گروہ ہرگز یہ حق نہیں رکھتا کہ اُن کی طرف سے اِس طرح کے کسی اقدام کا فیصلہ کرے۔

۲۔ قرآن میں اِس کا حکم اصلاً فتنہ کے استیصال کے لیے آیا ہے۔ اِس کے معنی کسی شخص کو ظلم و جبر کے ساتھ اُس کے مذہب سے برگشتہ کرنے کی کوشش کے ہیں۔ یہی چیز ہے جسے انگریزی زبان میں 'persecution' کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جان و مال اور عقل و رائے کے خلاف زیادتی کی دوسری تمام صورتیں اِسی کے تحت ہیں۔ چنانچہ ظلم وعدوان جس صورت میں بھی ہو، یہ اُس کے خلاف کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ جہاد مسلمانوں پر اُس وقت تک فرض نہیں ہوتا، جب تک دشمن کے مقابلے میں اُن کی حربی قوت ایک خاص حد تک نہ پہنچ جائے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جہاد وقتال کی اِس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے وہ نہ صرف یہ کہ اپنے اخلاقی وجود کو محکم رکھنے کی کوشش کریں، بلکہ اپنی حربی قوت بھی اُس درجے تک لازماً بڑھائیں جس کا حکم قرآن نے زمانۂ رسالت کے مسلمانوں کو اُس وقت کی صورت حال کے لحاظ سے دیا تھا اور اُن کے اور اُن کے دشمنوں کے درمیان اِس کے لیے ایک اور دو کی نسبت قائم کر دی تھی۔

۴۔ جہاد میں عملاً حصہ نہ لینا صرف اُس صورت میں جرم ہے، جب کوئی مسلمان

نفیر عام کے باوجود گھر میں بیٹھا رہے۔ اُس وقت یہ بے شک، نفاق جیسا بڑا جرم بن جاتا ہے۔ یہ صورت نہ ہو تو جہاد ایک فضیلت ہے جس کے حصول کا جذبہ ہر شخص میں ہونا چاہیے۔ لیکن اِس کی حیثیت ایک درجۂ فضیلت ہی کی ہے، یہ اُن فرائض میں سے نہیں ہے جنھیں پورا نہ کیا جائے تو آدمی مجرم قرار پائے۔

۵۔ جہاد اخلاقی حدود سے بے پروا ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اللہ تعالیٰ نے اِن سے انحراف کی اجازت کسی شخص کو نہیں دی۔ اِس حکم کے ذیل میں جو سب سے اہم ہدایت قرآن میں بیان ہوئی ہے، وہ عہد کی پابندی کی ہے۔ غدر اور نقض عہد کو اللہ تعالیٰ نے بدترین گناہ قرار دیا ہے۔ چنانچہ کوئی معاہد قوم اگر مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہی ہو تو معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اُن کی مدد نہیں کی جا سکتی۔ اِسی طرح جو لوگ جنگ کے لیے نہ نکلیں یا جنگ کے موقع پر کسی وجہ سے غیر جانب دار رہنا چاہتے ہوں، اُن کے خلاف بھی کسی اقدام کی اجازت نہیں ہے۔ یہ صرف مقاتلین 'combatants' کے خلاف کیا جا سکتا ہے۔

نہی عن المنکر

ایمان کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ لوگوں کو بھلائی کی تلقین کی جائے اور برائی

سے روکا جائے۔ یہ تلقین کرنا اور روکنا، دونوں حکمت وموعظت کے ساتھ اور دعوت و نصیحت کے اسلوب میں ہونے چاہییں۔ لوگوں کی ہدایت اور گمراہی کا معاملہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ وہ اُن کو بھی جانتا ہے جو اُس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور اُن کو بھی جو ہدایت پانے والے ہیں، اِس لیے حق وانصاف کی دعوت کے لیے نہ کسی شخص کو داروغہ بننا چاہیے اور نہ اپنے مخاطبین کے لیے جنت اور جہنم کے فیصلے صادر کرنے چاہییں۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ داعی حق کی حیثیت سے خدا کے کسی پیغمبر کو بھی تذکیر ونصیحت اور بلاغ مبین سے آگے کسی اقدام کی اجازت نہیں دی گئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَآ اَنۡتَ مُذَكِّرٌ، لَسۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِمُصَيۡطِرٍ. (الغاشیہ ۸۸: ۲۱-۲۲) ''تم نصیحت کرنے والے ہو، تم اِن پر کوئی داروغہ نہیں ہو۔''

دائرۂ اختیار کا معاملہ، البتہ مختلف ہے۔ سن رشد کو پہنچنے کے بعد آدمی کسی عورت کا شوہر اور اِس کے نتیجے میں بچوں کا باپ بنتا ہے۔ بنی آدم کی یہ دونوں حیثیتیں دین و فطرت کی رو سے اُن کا ایک دائرۂ اختیار پیدا کرتی ہیں۔ یہی صورت اداروں اور حکومتوں کی ہے۔ یہ جب قائم ہو جاتی ہیں تو اِن کے سربراہوں کے لیے بھی ایک دائرۂ اختیار پیدا ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسی دائرے کے اندر ہونے والی برائیوں کے بارے میں فرمایا ہے:

من رأی منکم منکرًا فلیغیرہ ''تم میں سے کوئی شخص برائی دیکھے تو

بیدہ، فان لم یستطع فبلسانہ، فان لم یستطع فبقلبہ، وذلك اضعف الایمان. (مسلم،رقم ۱۷۷)

اُسے چاہیے کہ ہاتھ سے اُس کا ازالہ کرے۔ پھر اگر اِس کی ہمت نہ ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اُسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔''

برائی کے لیے اِس روایت میں 'مُنکر' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اِس سے مراد وہ برائیاں نہیں ہیں جو خالص مذہبی احکام کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتی ہیں، بلکہ وہ برائیاں ہیں جنھیں پوری انسانیت بلا امتیاز مذہب وملت برائی سمجھتی ہے۔ چوری، جھوٹ، بد دیانتی، غبن، خیانت، ناپ تول میں کمی، ملاوٹ، حق تلفی، فواحش، جان، مال اور آبرو کے خلاف زیادتی اور اِس نوعیت کی دوسری برائیوں کو عربی زبان میں لفظ 'مُنکر' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد انھی برائیوں سے متعلق ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا جو حکم قرآن میں بیان ہوا ہے، یہ اُسی کی فرع ہے۔ آپ نے تنبیہ فرمائی ہے کہ اِن برائیوں کو اپنے اپنے دائرۂ اختیار میں دل سے بھی برا نہیں سمجھو گے تو اِس سے آگے پھر ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

'ان لم یستطع' کے جو الفاظ اِس روایت میں آئے ہیں، اُن کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ اِن سے مراد وہ استطاعت نہیں ہے جو آدمی کو کسی چیز کا مکلّف ٹھیراتی ہے، اِس لیے کہ اُس کے نہ ہونے سے وہ اگر کسی حکم پر عمل نہیں کرتا تو ایمان کے کسی نچلے درجے میں

نہیں آجاتا۔ روایت میں یہ الفاظ ہمت اور حوصلے کے معنی میں استعمال ہوئے ہیں جو ایمان کی قوت اور کمزوری سے کم یا زیادہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ یہ صرف دائرۂ اختیار ہے جس میں کوئی شخص اگر برائی کو ہاتھ سے نہیں روکتا تو اُس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایمان کے پہلے درجے پر نہیں رہا، اِس لیے کہ اختیار واقتدار کے باوجود اُس نے برائی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اِس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ایمان کے اِس درجے کو پانے کے لیے لوگ اپنے پیرووں کے جتھے منظّم کریں اور ازالۂ منکر کی غرض سے نکل کھڑے ہوں۔ اِس طرح کا اقدام اگر کیا جاتا ہے تو یہ بدترین فساد ہوگا جس کی دین میں کوئی گنجایش نہیں ہے۔ دین کے تمام احکام انسان کے اختیار اور اُس کی استطاعت کے لحاظ سے دیے گئے ہیں۔ 'لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا'* ایک قطعی اصول ہے جو دین وشریعت کے سارے احکام میں ملحوظ ہے۔ نہی عن المنکر کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو اِسی اصول کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔

رویت ہلال کا مسئلہ

اللہ تعالیٰ نے روزوں کے لیے رمضان اور حج کے لیے ذوالحجہ کا مہینا مقرر فرمایا

* البقرہ ۲: ۲۸۶۔ ''اللہ (اپنے احکام میں) کسی جان پر اُس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔''

ہے۔ یہ دونوں قمری مہینے ہیں، اِس لیے یہ سوال ابتدا ہی سے زیر بحث رہا ہے کہ ان کی تعیین کس طرح کی جائے؟ علم فلکیات نے جو ترقی اِس زمانے میں کی ہے، اُس سے پہلے بھی لوگ اِس بات سے تو واقف تھے کہ قمری مہینے تیس دن سے زیادہ کے نہیں ہو سکتے، مگر عام مشاہدہ بتاتا تھا کہ یہ انتیس دن کے بھی ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے جب لوگوں کو پورے مہینے کے روزے رکھنے کا حکم دیا تو اندیشہ ہوا کہ اُن میں سے کچھ لوگ اِس حکم کی تعمیل میں تیس دن پورے کرنے پر اصرار کریں گے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا کہ چاند نظر آ جائے تو رمضان کا مہینا شروع کر لینا چاہیے اور نظر آ جائے تو اُس کو ختم کر دینا چاہیے۔ اِس کے لیے تیس دن پورے کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہاں، مطلع صاف نہ ہو تو تیس دن لازماً پورے کیے جائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی ارشاد ہے جسے راویوں نے اپنے تصرفات سے وہ صورت دے دی جس سے یہ تاثر عام ہو گیا کہ آپ نے مہینے کی تعیین کے لیے لوگوں کو چاند دیکھنے کا پابند کر دیا ہے۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ روایت کے ایک طریقے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت اپنی اصل صورت میں بھی نقل ہو گئی ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

الشهر تسع وعشرون، فاذا رأيتم الهلال فصوموا، واذا رأيتموه فافطروا، فان غم عليكم فاقدروا له.

(مسلم، رقم ۱۰۸۰)

''مہینا انتیس دن کا بھی ہوتا ہے، اِس لیے چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور دیکھ لو تو افطار کرو۔ پھر اگر مطلع صاف نہ ہو تو دن پورے کر لو۔''

یہ عبداللہ بن عمر کی روایت ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ایک طریق میں بھی بعینہٖ یہی الفاظ ہیں۔ اِس سے واضح ہے کہ مہینے کی تعیین کے لیے چاند دیکھنے کو لازم نہیں کیا گیا، بلکہ چاند دیکھ لینے کے بعد مہینا شروع کر لینے کو لازم ٹھیرایا گیا ہے تاکہ لوگ یہ خیال کر کے کہ قرآن نے پورے مہینے کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی ہے، تیس دن پورے کرنے پر اصرار نہ کریں۔ چنانچہ بات کی ابتدا ہی یہاں سے ہوتی ہے کہ 'الشھر تسع و عشرون'، مہینا انتیس دن کا بھی ہوتا ہے۔

چاند دیکھنے کی ضرورت اِسی بنا پر ہے۔ تیس دن پورے ہو جائیں تو یہ ضرورت باقی نہیں رہتی، اِس لیے کہ اِس معاملے میں ہمارا علم بالکل قطعی ہے۔ چاند نظر آئے یا نہ آئے، ہم جانتے ہیں کہ پچھلا مہینا ختم ہوا اور اگلا مہینا شروع ہو چکا ہے۔ علم کی ترقی نے یہی صورت انتیس کے بارے میں بھی پیدا کر دی ہے۔ اب ہم پوری قطعیت کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ دنیا کے لیے چاند کی پیدایش کب ہوگی۔ اِس لیے مکہ مکرمہ کو مرکز بنا کر اگر چاند کی پیدایش کے لحاظ سے قمری کیلنڈر بنا دیا جائے اور تمام مذہبی تہوار اُسی کے مطابق منائے جائیں تو اِس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ دین کا منشا مہینے کی تعیین ہے۔ وہ اگر چاند دیکھنے سے ہو سکتی تھی تو اُس نے اُسے اختیار کیا اور اب اگر کسی دوسرے ذریعے سے ہو سکتی ہے تو اِس پر بھی اُسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ گھڑی ایجاد ہو جانے کے بعد ہم اپنی نمازوں کے لیے جس طرح سورج کا طلوع و غروب دیکھنے کے پابند نہیں رہے، اِسی طرح قمری مہینوں کی تعیین کے لیے رویت ہلال کے پابند بھی

نہیں رہے۔ یہ مسئلہ محض ایک حدیث میں راویوں کے تصرفات سے پیدا ہوا ہے۔ روایت کے تمام طریقوں کو دیکھنے سے یہ حقیقت بادنیٰ تامل واضح ہو جاتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا بالکل دوسرا تھا۔

چاند دیکھنے پر اصرار کے لیے اِس کے بعد بھی کوئی وجہ باقی رہ جاتی ہے؟ ہمارے علما کو اب اِس پر غور کرنا چاہیے۔

www.ghamidi.net

ڈاڑھی اور اسبال ازار

ڈاڑھی مرد رکھتے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ڈاڑھی رکھی ہوئی تھی۔ آپ کے ماننے والوں میں سے کوئی شخص اگر آپ کے ساتھ تعلق خاطر کے اظہار کے لیے یا آپ کی اتباع کے شوق میں ڈاڑھی رکھتا ہے تو اِسے باعث سعادت سمجھنا چاہیے، لیکن یہ دین کا کوئی حکم نہیں ہے۔ لہٰذا کوئی شخص اگر ڈاڑھی نہیں رکھتا تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کسی فرض و واجب کا تارک ہے یا اُس نے کسی حرام یا ممنوع فعل کا ارتکاب کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس معاملے میں جو کچھ فرمایا ہے، وہ ڈاڑھی رکھنے کی ہدایت نہیں ہے، بلکہ اِس بات کی ممانعت ہے کہ ڈاڑھی اور مونچھیں رکھنے کی کوئی ایسی وضع اختیار نہیں کرنی چاہیے جو متکبرانہ ہو۔ تکبر ایک بڑا

جرم ہے۔ یہ انسان کی چال ڈھال، گفتگو، وضع قطع، لباس اور نشست و برخاست، ہر چیز میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہی معاملہ ڈاڑھی اور مونچھوں کا بھی ہے۔ بعض لوگ ڈاڑھی مونڈھتے ہیں یا چھوٹی رکھتے ہیں، لیکن مونچھیں بہت بڑھا لیتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِسے پسند نہیں کیا اور اِس طرح کے لوگوں کو ہدایت فرمائی ہے کہ متکبرین کی وضع اختیار نہ کریں۔ وہ اگر بڑھانا چاہتے ہیں تو ڈاڑھی بڑھا لیں، مگر مونچھیں ہر حال میں چھوٹی رکھیں*۔ انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے جو ہدایت انسان کو ملی ہے، اُس کا موضوع عبادات ہیں، تطہیر بدن ہے، تطہیر خورونوش اور تطہیر اخلاق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے، تطہیر اخلاق کے مقصد سے فرمایا ہے۔ ڈاڑھی سے متعلق آپ کی نصیحت کا صحیح محل یہی تھا، مگر لوگوں نے اِسے ڈاڑھی بڑھانے کا حکم سمجھا اور اِس طرح ایک ایسی چیز دین میں داخل کر دی جو اِس سے کسی طرح متعلق نہیں ہو سکتی۔

یہی معاملہ ٹخنوں سے نیچی ازار کا ہے۔ عرب جاہلی میں متکبرین کا عام طریقہ تھا کہ لمبا قمیص پہنیں گے، پگڑی کا شملہ کمر سے نیچے تک لٹکتا ہوا ہوگا، ازار ٹخنوں سے اِس قدر نیچے ہوگی کہ گویا آدھی زمین پر گھسٹ رہی ہے۔ عربی زبان میں اِسے اسبال کہتے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کو سخت ناپسند کیا اور فرمایا ہے کہ اللہ قیامت کے دن

---

* بخاری، رقم ۵۸۹۲۔ مسلم، رقم ۶۰۲۔

اُس شخص کو دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا جو غرور سے اپنا تہ بند گھسیٹتے ہوئے چلتا ہو*۔ ازار کے بارے میں تمام روایات اِسی وضع سے متعلق ہیں۔

تہ بند کے بارے میں یہ بات، البتہ کہی جا سکتی ہے کہ اُسے ٹخنوں سے نیچے لٹکتا ہوا چھوڑ دیا جائے تو متکبرین کی اِس وضع سے ایک نوعیت کی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے، اِس لیے لٹکانے کی وجہ تکبر نہ بھی ہو تو احتیاط کرنی چاہیے۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے، لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ مشابہت تہ بند ہی میں ہوتی ہے، ہماری شلوار، پاجامے اور پتلون سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

[۲۰۰۸ء]

وصیت کا حق

تقسیم وراثت کا جو قانون قرآن میں بیان ہوا ہے، اُس میں بار بار تاکید کی گئی ہے کہ یہ تقسیم اُس وصیت کے بعد ہے جو مرنے والا کسی کے لیے کرتا ہے۔ اِس پر دو سوالات پیدا ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ وصیت کے لیے کوئی حد مقرر کی گئی ہے یا آدمی جس کے لیے جتنی چاہے

* بخاری، رقم ۵۷۸۳۔ مسلم، رقم ۵۴۵۵۔

وصیت کرسکتا ہے؟

دوسرا یہ کہ وصیت کیا اُن لوگوں کے حق میں بھی ہوسکتی ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے میت کا وارث ٹھیرایا ہے؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ میں کسی تحدید کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علی الاطلاق فرمایا ہے کہ یہ تقسیم مرنے والے کی وصیت پوری کرنے کے بعد کی جائے گی۔ زبان و بیان کے کسی قاعدے کی رو سے اِس اطلاق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے جو روایت اِس معاملے میں نقل ہوئی ہے، اُس کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ آپ کے ایک صحابی نے آپ کے سامنے اپنی اِس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ مرنے کے بعد وہ اپنا سارا مال اللہ کی راہ میں دینا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ زیادہ ہے، آدمی کے پاس مال ہو تو اُسے اپنے وارثوں کو محتاج چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔ اُنھوں نے دو تہائی اور پھر آدھا مال دینے کے لیے پوچھا۔ اِس پر بھی آپ نے وہی بات فرمائی۔ اُنھوں نے پوچھا کہ ایک تہائی دے دوں۔ آپ نے فرمایا: یہی بہت ہے*۔ ہر شخص اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ خاص صورت حال میں ایک خاص شخص کے فیصلے پر آپ کا تبصرہ ہے۔ اِس کا کسی قانونی تحدید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

---

* بخاری، رقم ۲۷۴۲۔ مسلم، رقم ۱۶۲۸۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ وارثوں کے حق میں خود اللہ تعالیٰ نے وصیت کر دی ہے۔ اللہ کی وصیت کے مقابلے میں کوئی مسلمان اپنی وصیت پیش کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا۔ لہٰذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ اُن کے لیے کوئی وصیت بر بناے رشتہ داری نہیں ہوسکتی، مگر اِنھی وارثوں کی کوئی ضرورت یا اِن میں سے کسی کی کوئی خدمت یا اِسی نوعیت کی کوئی دوسری چیز تقاضا کرے تو وصیت یقیناً ہوسکتی ہے۔ چنانچہ کسی کا کوئی بچہ اگر زیر تعلیم ہے، دوسرے بچے برسر روزگار ہیں اور وہ ابھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوسکا یا بچوں میں سے کسی نے والدین کی زیادہ خدمت کی ہے یا کسی کو اپنی بیوی کے معاملے میں اندیشہ ہے کہ اُس کے دنیا سے رخصت ہوجانے کے بعد اُس کا کوئی پرسان حال نہ ہوگا تو وہ اِن کے حق میں وصیت کرسکتا ہے۔ یہ وصیت جس طرح دوست احباب کے لیے ہوسکتی ہے، صدقہ وخیرات کی غرض سے ہوسکتی ہے، اِسی طرح اِن وارثوں کے حق میں بھی ہوسکتی ہے۔ اِس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

[۲۰۰۸ء]

سود کا مسئلہ

سود کا لفظ اُس معین اضافے کے لیے بولا جاتا ہے جو قرض کی رقم پر لیا جائے۔

اِس میں اور کرایے میں بظاہر کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا، لیکن دقت نظر سے دیکھا جائے تو صاف واضح ہوجاتا ہے کہ جو چیزیں کرایے پر اٹھائی جاتی ہیں، وہ اُن کے وجود کو برقرار رکھ کر استعمال کی جاسکتی ہیں، مگر روپیہ اِس طریقے سے استعمال نہیں کیا جاسکتا، اِسے خرچ کر لینے کے بعد دوبارہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اِس پر اگر کسی اضافے کا مطالبہ کیا جائے تو یہ فی الواقع ظلم بن جاتا ہے۔ سود اور کرایے کا یہ فرق چونکہ باریک ہے اور انسان اِس کے سمجھنے میں غلطی کرسکتا تھا، اِس لیے اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے انسان کو اپنی شریعت دی تو اُسے بتادیا کہ قرض پر معین اضافے کا مطالبہ زیادتی ہے، اِسے جائز قرار نہیں دیا جاسکتا۔ سود اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ کی ہر شریعت میں اور ہمیشہ ممنوع رہا ہے۔ قرآن نے بھی پوری صراحت کے ساتھ اِسے ممنوع ٹھیرایا ہے، اِس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بنکاری کا جو نظام اِس زمانے میں رائج ہے، اُس کے بارے میں یہ بحث، البتہ پیدا ہوگئی ہے کہ اِس میں تو بنک جس کاروبار کے لیے قرض دیتا ہے، اُس کی منفعت ہی سے حصہ وصول کرتا ہے۔ لہٰذا سود جس علت کی بنا پر ممنوع قرار دیا گیا ہے، وہ بنکاری کے نظام میں کیا ختم نہیں ہوجاتی؟ یہ استدلال مصر و شام کے بعض علما نے بھی پیش کیا ہے اور ہندوستان کے ایک جلیل القدر عالم اور داعی مولانا وحیدالدین خان نے بھی اپنی کتاب ''فکر اسلامی'' میں کسی حد تک اِس کی تصویب فرمائی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ علما کا یہ استدلال معقول ہوسکتا ہے، مگر اِس کے لیے ضروری ہے کہ بنک اپنے نظام میں درج ذیل اصلاحات کرلیں:

اولاً، جس کاروبار کے لیے قرض دیا گیا ہے، اُس میں نقصان ہو جائے یا کاروبار کسی وجہ سے بند کرنا پڑے تو منفعت کا مطالبہ بھی اُسی دن سے بند کر دیا جائے۔ بنک اِس کے بعد صرف اصل زر کا تقاضا کرے۔

ثانیاً، اشیا قسطوں پر فروخت کی جائیں تو جب تک قسطیں پوری نہ ہوں، بنک اُس شے کی ملکیت میں شریک رہے، ملکیت کے تقاضے پورے کرے اور اُن پر کرایہ لے۔

ثالثاً، قرض اگر غیر کاروباری ضرورتوں کے لیے دیا گیا ہے تو افراط زر سے جو کمی واقع ہوتی ہے، اُس کی تلافی کے سوا کسی زائد رقم کا مطالبہ نہ کیا جائے۔

سود سے متعلق ایک اہم مسئلہ اُن لوگوں کا بھی ہے جو سود لیتے نہیں، مگر ذاتی اور کاروباری ضرورتوں کے لیے قرض لیتے اور اُس پر سود دیتے ہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ بھی اُسی طرح حرام ہے، جس طرح سود لینا حرام ہے۔ علما یہی کہتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس کی کوئی بنیاد قرآن وحدیث میں نہیں ہے۔ قرآن نے کسی جگہ ایک لفظ بھی سود دینے والوں کی مذمت میں نہیں کہا، بلکہ اُنھیں مظلوم قرار دیا اور تنگ دست ہوں تو اصل زر کی واپسی کے لیے مہلت دینے کی تلقین فرمائی ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ حدیث میں سود کھلانے والوں کو بھی یکساں مجرم ٹھیرایا گیا ہے*، لیکن اِس کا مطلب سمجھنے میں لوگوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اِس سے مراد وہ لوگ ہیں جو سود کا

* مسلم، رقم ۴۰۹۳۔

کاروبار کرنے والوں کے ایجنٹ کی حیثیت سے اُن کے لیے گاہک ڈھونڈتے اور اِس طرح اُنھیں سود کھلا کر ایک بڑے گناہ میں تعاون کے مجرم بنتے ہیں، سود پر قرض لینے والوں سے اِس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

[۲۰۰۸ء]

عورت کی تادیب

نکاح ایک معاہدہ ہے جس میں مرد پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ بیوی بچوں کے اخراجات فراخ دلی کے ساتھ پورے کرے اور اُن کے ساتھ اِس طرح کا برتاؤ کرے جو شریفوں کے شایان شان ہو، عقل وفطرت کے مطابق ہو، رحم ومروت پر مبنی ہو اور اُس میں عدل وانصاف کے تقاضے ملحوظ رہے ہوں۔ اِسی طرح عورت سے تقاضا کیا جاتا ہے کہ اُسے شوہر کے ساتھ موافقت اور فرماں برداری کا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور شوہر کے رازوں اور اُس کی عزت وناموس کی حفاظت کرنی چاہیے۔

تمام دوسرے معاہدات کی طرح معاہدے کی یہ نوعیت بھی تقاضا کرتی ہے کہ فریقین میں سے اگر کوئی اِس کی خلاف ورزی کرے اور تنبیہ، تلقین اور زجر وتوبیخ کے باوجود اپنی اصلاح کے لیے تیار نہ ہو تو اُس کی تادیب کی جائے۔ یہ تادیب عدالت بھی

کرسکتی ہے اور خاندان کے بڑے اور بزرگ بھی کر سکتے ہیں۔ قرآن نے یہ حق شوہر کو بھی دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ عورت اگر اُس کی قوامیت کو چیلنج کر کے سرکشی پر اتر آئے تو اپنا گھر بچانے کے لیے وہ تین صورتیں اختیار کرسکتا ہے:

پہلی یہ کہ عورت کو نصیحت کی جائے۔ قرآن میں اِس کے لیے 'وعظ' کا لفظ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اِس میں کسی حد تک زجر و توبیخ بھی ہوسکتی ہے۔

دوسری یہ کہ اُس سے بے تکلفانہ قسم کا خلا ملا ترک کر دیا جائے تاکہ اُسے اندازہ ہو کہ اُس نے اپنا رویہ نہ بدلا تو اِس کے نتائج غیر معمولی ہو سکتے ہیں۔

تیسری یہ کہ اُسے جسمانی سزا دی جائے۔

اِس آخری چیز کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمدن کی تبدیلی کے ساتھ ریاست کیا شوہروں کو پابند کرسکتی ہے کہ پہلی دونوں تدابیر اگر موثر نہ ہوں اور سزا کی نوبت آجائے تو وہ خود کوئی اقدام نہیں کریں گے، بلکہ معاملہ عدالت کے سپرد کر دیں گے؟

ہمارا جواب یہ ہے کہ یقیناً کرسکتی ہے، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر عمل کے لیے یہ محض طریق کار کی تبدیلی ہے، اِس سے کوئی حکم معطل نہیں ہوتا۔ عورت کی اصلاح کے لیے سزا شوہر دے، خاندان کے بزرگ دیں یا عدالت، اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ گھر کو بچانے کے لیے اگر سزا بھی دینی پڑے تو دی جائے۔ یہ اصلاح کی ایک تدبیر ہے، اِس سے زیادہ اِس سے کچھ مقصود نہیں ہے۔

[۲۰۰۸ء]

طلاق کا حق

نکاح محض اِس چیز کا نام نہیں ہے کہ مرد وعورت کا جنسی تعلق قانون کے دائرے میں آجائے۔ یہ ایک معاہدہ ہے جس سے خاندان کا ادارہ وجود میں آتا ہے۔ یہ ادارہ انسانیت کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اِس کے بغیر انسان کی حیاتی، نفسیاتی اور معاشرتی ضرورتیں کسی طرح پوری نہیں کی جاسکتیں۔ یہ عورت کے اِس فیصلے سے قائم ہوتا ہے کہ وہ برابری کی سطح پر اور ایک دوست کی حیثیت سے نہیں، بلکہ بیوی کی حیثیت سے اپنے آپ کو ایک مرد کے حبالۂ عقد میں دے رہی ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ مرد کو اُس نے اُس ادارے کا سربراہ تسلیم کرلیا ہے جو اُن کے باہمی تعلق سے وجود میں آنے والا ہے۔ اِس سے جس طرح یہ ذمہ داری مرد پر عائد ہوجاتی ہے کہ عورت اور اُس کے بچوں کی تمام معاشی ضرورتیں اب وہ پوری کرے گا، اِسی طرح عورت بھی پابند ہوجاتی ہے کہ اگر خدانخواستہ نباہ نہ ہوسکے تو علیحدگی کا کوئی اقدام وہ مرد سے معاملہ کیے بغیر نہ کرے۔ چنانچہ طلاق کی نوبت آجائے تو وہ طلاق دے گی نہیں، بلکہ طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ عام حالات میں توقع یہی ہے کہ ہر شریف النفس آدمی نباہ کی کوئی صورت نہ پاکر یہ مطالبہ مان لے گا، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو عورت کیا کرے؟ اِس سوال کا کوئی

جواب شریعت نے نہیں دیا، بلکہ زندگی کے بعض دوسرے معاملات کی طرح اِسے ہمارے اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ زمانۂ رسالت سے لے کر اب تک جو طریقہ اِس کے لیے اختیار کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ عورت اِس طرح کی صورت حال میں عدالت سے رجوع کرتی ہے۔ اِس زمانے میں یہ بہت کچھ باعث زحمت ہو جاتا ہے۔ اِس کا ایک حل یہ سوچا گیا کہ مرد سے منوالیا جائے کہ اُس نے طلاق کا حق عورت کو تفویض کر دیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں اِس طرح کا تقاضا خاص کر نکاح کے موقع پر آسان نہیں ہوتا۔ پھر یہ چیز اُس حکمت کو بھی باطل کر دیتی ہے جس کے لیے طلاق کا حق عورت کو نہیں دیا گیا، اِس لیے ہمارا خیال ہے کہ ریاست کی سطح پر یہ قانون بنا دینا چاہیے کہ مطالبۂ طلاق کے بعد اگر شوہر نوے دن کے اندر طلاق نہیں دیتا تو نکاح آپ سے آپ فسخ ہو جائے گا اور اموال و املاک سے متعلق اگر کوئی نزاع ہے تو فریقین عدالت سے رجوع کریں گے۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اِس وقت جو نکاح نامہ رائج ہے، اُس میں سے حق طلاق کی تفویض کا کالم ختم کر کے درج ذیل عبارت نکاح نامہ کی ابتدا میں درج کر دی جائے:

''یہ نکاح اِس شرط کے ساتھ منعقد ہوا ہے کہ بیوی اگر کبھی تحریری طور پر طلاق کا مطالبہ کرے گی تو شوہر نوے دن کے اندر اُسے طلاق دینے کا پابند ہوگا۔ وہ اگر ایسا نہیں کرے گا تو یہ مدت گزر جانے کے بعد اُس کی طرف سے بیوی پر آپ سے آپ طلاق واقع ہو جائے گی۔ اِس طلاق کے بعد شوہر کے لیے رجوع کا حق نہیں

ہوگا اور بیوی پابند ہوگی کہ مہر اور نان ونفقہ کے علاوہ اگر کوئی اموال واملاک شوہر نے اُسے دے رکھے ہیں اور طلاق کے موقع پر وہ اُنھیں واپس لینا چاہتا ہے تو فصل نزاع کے لیے عدالت سے رجوع کرے یا اُس کا مال اُسے واپس کر دے۔''

یہ طریقہ اگر اختیار کر لیا جائے تو عورت اور اُس کے گھر والوں کو کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرنا پڑے گا جو نکاح کے موقع پر کسی بدمزگی کا باعث بن جائے۔

شوہر کو نوے دن کی مہلت مل جائے گی جس میں وہ عورت کو یہ مطالبہ واپس لینے کے لیے آمادہ کر سکتا ہے۔

طلاق شوہر کی طرف سے ہوگی، اِس لیے وہ تمام حکم ومصالح اپنی جگہ قائم رہیں گے جو اللہ تعالیٰ کے قانون میں ملحوظ ہیں۔

[۲۰۰۸ء]

سر کی اوڑھنی

اللہ تعالیٰ کی ہدایت ہے کہ مسلمان عورتیں اپنے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے سوا جسم

کے کسی حصے کی زیبایش، زیورات وغیرہ اجنبی مردوں کے سامنے نہیں کھولیں گی۔ قرآن نے اِسے لازم ٹھیرایا ہے۔ سر پر دوپٹا یا اسکارف اوڑھ کر باہر نکلنے کی روایت اِسی سے قائم ہوئی ہے اور اب اسلامی تہذیب کا حصہ بن چکی ہے۔ عورتوں نے زیورات نہ پہنے ہوں اور بناؤ سنگھار نہ بھی کیا ہو تو وہ اِس کا اہتمام کرتی رہی ہیں۔ یہ رویہ بھی قرآن ہی کے اشارات سے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ دوپٹے سے سینہ اور گریبان ڈھانپ کر رکھنے کا حکم اُن بوڑھیوں کے لیے نہیں ہے جو نکاح کی امید نہیں رکھتی ہیں، بشرطیکہ وہ زینت کی نمایش کرنے والی نہ ہوں۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ وہ اپنا یہ کپڑا مردوں کے سامنے اتار سکتی ہیں، اِس میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر ساتھ ہی وضاحت کر دی ہے کہ پسندیدہ بات اُن کے لیے بھی یہی ہے کہ احتیاط کریں اور دوپٹا سینے سے نہ اتاریں۔ اِس سے واضح ہے کہ سر کے معاملے میں بھی پسندیدہ بات یہی ہونی چاہیے اور بناؤ سنگھار نہ بھی کیا ہو تو عورتوں کو دوپٹا سر پر اوڑھ کر رکھنا چاہیے۔ یہ اگرچہ واجب نہیں ہے، لیکن مسلمان عورتیں جب مذہبی احساس کے ساتھ جیتی اور خدا سے زیادہ قریب ہوتی ہیں تو وہ یہ احتیاط لازماً ملحوظ رکھتی ہیں اور کبھی پسند نہیں کرتیں کہ کھلے سر اور کھلے بالوں کے ساتھ اجنبی مردوں کے سامنے ہوں۔

[۲۰۰۸ء]

نیل پالش

عورتیں اپنے ناخن کسی نہ کسی چیز سے رنگتی رہی ہیں۔ ہمارے زمانے میں اِس کے لیے مختلف اقسام کی نیل پالش ایجاد ہوگئی ہیں۔ مہندی وغیرہ کے برعکس اِس کی موٹی تہ چونکہ ناخن پر جما لی جاتی ہے، اِس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ اِس کے ساتھ وضو کا کیا کیا جائے؟ اِس کے تین جواب دیے گئے ہیں:

ایک یہ کہ نیل پالش پر وضو نہیں ہوتا، اِس لیے ہر وضو سے پہلے اِسے لازماً اتارنا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ نیل پالش لگانے کے بعد بھی ہاتھ ہاتھ ہی ہوتا ہے، اِس لیے وضو ہو جائے گا۔ اِسے اتارنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تیسرا یہ کہ اِسے جرابوں کے مسح پر قیاس کرنا چاہیے۔ چنانچہ نیل پالش اگر وضو کر کے لگائی گئی ہے تو اتارنے کی ضرورت نہیں ہے، اِس کے اوپر ہی وضو کر لیا جائے گا، لیکن وضو کے بغیر لگائی گئی ہے تو اِسے اتار کر وضو کرنا چاہیے۔

ہمارے نزدیک یہی تیسرا مسلک قابل ترجیح ہے۔ یہ احتیاط کا مسلک ہے، اِس میں کوئی مشقت بھی نہیں ہے اور تزکیہ وتطہیر کے مقصد سے بھی یہ زیادہ قریب ہے۔ اِس لیے بہتر یہی ہے کہ عورتیں اپنے پروردگار کے حضور میں حاضری کے لیے اِس کا

اہتمام کرلیں۔

[۲۰۰۸ء]

عورتوں کا سفر

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے بیان کیا گیا ہے کہ آپ نے عورتوں کو محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا اور فرمایا ہے کہ اِس طرح کا سفر اُن کے لیے جائز نہیں ہے۔ اِس کی مدت بعض روایتوں میں ایک، بعض میں دو اور بعض میں تین شب و روز بیان ہوئی ہے*۔ یہ سدذریعہ کی ہدایت ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز سے روکا گیا ہے، وہ اصلاً ممنوع نہیں ہے، لیکن ممنوعات میں سے کسی چیز تک پہنچنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اِس کے مخاطبین بھی افراد بحیثیت افراد ہیں۔ اِس میں ریاست سے یہ تقاضا نہیں کیا گیا کہ وہ کسی عورت کو محرم کے بغیر سفر کی اجازت نہیں دے گی۔ پھر یہ بات بھی واضح ہے کہ اِس طرح کی ہدایات ہمیشہ حالات سے متعلق ہوتی ہیں۔ اسلام میں عورت کی عفت و عصمت کو جو اہمیت حاصل ہے، اُس کے پیش نظر ضروری تھا کہ زمانۂ رسالت کے حالات میں اُنھیں محرم کے بغیر سفر کرنے سے روکا جائے۔ اُس زمانے میں سفر پیدل یا

---

* بخاری، رقم ۱۰۸۶۔ مسلم، رقم ۳۲۷۰۔

اونٹ گھوڑوں پر کیا جاتا تھا۔ جن مقامات تک اب ہم گھنٹوں میں پہنچ جاتے ہیں، اُس وقت وہاں پہنچنے میں ہفتے، بلکہ مہینے لگ جاتے تھے۔ مسافر تنہا یا قافلوں میں سفر کرتے اور بعض اوقات جنگلوں اور بیابانوں سے گزر کر اپنی منزل تک پہنچتے تھے۔ رات آ جاتی تو کھلے آسمان تلے قافلوں میں یا اجنبی شہروں کی سرایوں میں قیام کرنا پڑتا تھا۔ اِس طرح کے حالات میں اگر عورتوں کی حفاظت کے پیش نظر اور اُنھیں کسی تہمت سے بچانے کے لیے پابند کیا گیا کہ وہ محرم کے بغیر سفر نہ کریں تو اِس کی حکمت ہر سلیم الطبع آدمی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔

دورِ حاضر نے اِس کے برخلاف سفر کے ذرائع میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا ہے۔ مہینوں کا سفر اب گھنٹوں میں ہوتا ہے۔ ریل، جہاز اور بسوں میں حفاظت کے غیر معمولی انتظامات ہیں۔ ہوٹلوں اور سرایوں وغیرہ کا نظم بھی بالکل تبدیل ہو چکا ہے۔ آج سے سو سال پہلے اپنی بہن یا بیٹی کو تنہا ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک بھیجنے میں بھی تردد ہوتا تھا، لیکن اب یورپ اور امریکا کے سفر میں بھی اِس طرح کا کوئی تردد محسوس نہیں ہوتا۔ حج کا سفر بھی آخری درجے میں محفوظ ہو چکا ہے اور عورتیں اپنی شناسا عورتوں کی معیت میں نہایت اطمینان کے ساتھ حجاز مقدس جا سکتی اور حج وعمرہ کے مناسک ادا کر سکتی ہیں۔ حالات کی یہ تبدیلی تقاضا کرتی ہے کہ حکم کو دورِ حاضر کے سفروں سے متعلق نہ سمجھا جائے اور عورتوں کو اجازت دی جائے کہ خطرے کی کوئی جگہ نہ ہو تو اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے وہ تنہا یا عورتوں کی معیت میں جس طرح چاہیں، سفر کریں،

تاہم اتنی بات ملحوظ رکھیں کہ اُن کی عزت ہر حال میں محفوظ رہے اور گھروں سے نکلتے وقت اُن سے کوئی غفلت نہ ہو۔ وہ اگر اللہ اور اُس کے رسول کو ماننے والی ہیں تو اِس معاملے میں اُنھیں بے پروا نہیں ہونا چاہیے۔

اسقاطِ حمل

استقرارِ حمل پر ۱۲۰ دن گزر جائیں تو اُس کا اسقاط کسی حال میں جائز نہیں ہے۔ اِس مدت کے بعد جنین کا قتل درحقیقت انسان کا قتل ہے جو قرآن مجید کی رو سے پوری انسانیت کو قتل کر دینے کے مترادف ہے۔ اِس کی سزا قرآن میں ابدی جہنم بیان کی گئی ہے۔ اِس سے پہلے اسقاط، البتہ مباح ہے۔ مگر یہ اباحت بھی علی الاطلاق نہیں ہو سکتی، اِس کے لیے کوئی معقول عذر اور حقیقی سبب لازماً ہونا چاہیے۔ فقہ اسلامی میں اسقاط کے لیے ۱۲۰ دن کی یہ مدت اِس لیے مقرر کی گئی ہے کہ بچے کو انسانی شخصیت اِسی مدت کے خاتمے پر دی جاتی ہے۔ اِس سے پہلے وہ ایک حیوانی وجود ہوتا ہے۔ اُس کی زندگی بھی حیوانی زندگی ہوتی ہے۔ ۱۲۰ دن کی اِس مدت میں اُس کا حیوانی قالب پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُسے انسانی شخصیت عطا فرماتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جسے قرآن میں جنین کو ایک دوسری مخلوق میں تبدیل کر دینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد

فرمایاہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ	''ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے
سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ، ثُمَّ جَعَلْنٰهُ	سے پیدا کیا، پھر اُس کو ایک محفوظ جگہ
نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ، ثُمَّ	پانی کی بوند میں تبدیل کر دیا، پھر اس
خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا	بوند کو جنین کی صورت دی، پھر جنین کو
الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ	گوشت کا ایک لوتھڑا بنایا، پھر لوتھڑے
عِظٰمًا، فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا،	میں ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت
ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ، فَتَبٰرَكَ	چڑھادیا، پھر اُس کو ایک بالکل ہی دوسری
اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ.	مخلوق میں تبدیل کر دیا۔ سو بڑا ہی بابرکت
(المومنون ۲۳:۱۲-۱۴)	ہے اللہ بہترین پیدا کرنے والا۔''

ابتدا میں انسان کو زمین کے پیٹ سے پیدا کیا گیا تو اُس وقت بھی اللہ تعالیٰ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ پہلے انسان کا حیوانی وجود تخلیق ہوا، پھر اُس میں اپنی نسل آپ پیدا کر لینے کی صلاحیت ودیعت ہوئی، پھر اُس کا تسویہ کیا گیا، اِس طریقے سے جو مخلوق وجود میں آئی، اُس میں سے دو کا انتخاب کر کے پھر اُن میں روح پھونکی گئی، جس سے آدم وحوا کی صورت میں نطق وبیان کی صلاحیت اور عقل وشعور سے بہرہ یاب ایک نئی مخلوق، یعنی انسان کی ابتدا ہوگئی:

بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ،	''اُس نے انسان کی تخلیق کا آغاز مٹی

ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ، ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ، قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ. (السجدہ ۳۲:۷-۹)	سے کیا، پھر اُس کی نسل حقیر پانی کے خلاصے سے چلائی، پھر اُس کو نک سک سے درست کیا اور اُس میں اپنی روح پھونک دی اور (اِس طرح) تم کو کان اور آنکھیں اور دل عطا فرمائے ــ تم کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت فرمائی ہے کہ ماں کے پیٹ میں انسان کے حیوانی وجود کی تخلیق کے یہ تمام مراحل ۱۲۰ دن میں مکمل ہوتے ہیں۔ اِس کے بعد روح پھونکی جاتی ہے اور خدا کے حکم سے وہ شخصیت وجود میں آجاتی ہے جسے ہم انسان کہتے ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

ان احدکم یجمع خلقه فی بطن امه اربعین یومًا، ثم یکون فی ذلك علقة مثل ذلك، ثم یکون فی ذلك مضغة مثل ذلك، ثم یرسل الملك فینفخ فیه الروح. (مسلم، رقم ۲۶۴۳)	''تم میں سے ہر ایک کی خلقت ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک ہوتی ہے، پھر اتنی مدت میں وہ جنین بن جاتا ہے، پھر لوتھڑا بن کر پورا ہو جانے میں بھی اتنے ہی دن لگتے ہیں، پھر فرشتے کو بھیجا جاتا ہے اور وہ اُس میں روح پھونک دیتا ہے۔''

قرآن وحدیث کی یہی تصریحات ہیں جن کی بنا پر اسقاط کے لیے ۱۲۰ دن کی مدت مقرر کی گئی ہے۔

حفظ فروج

اسلامی شریعت تسکین شہوت کے لیے بیویوں کے سوا کسی کے ساتھ کوئی تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اللہ تعالیٰ نے اِسے حرام قرار دیا ہے اور سورۂ مومنون میں پوری وضاحت کے ساتھ بتادیا ہے کہ قضائے شہوت کے لیے جو لوگ اِن کے ماسوا کسی سے تعلق قائم کریں گے، وہ خدا کے حدود سے تجاوز کے مجرم ہوں گے۔ زمانۂ رسالت کی جن لونڈیوں کے لیے اُس وقت تک آزادی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی تھی، وہ، البتہ اِس حکم سے مستثنیٰ تھیں اور لوگ چاہتے تو اُن کے ساتھ بھی یہ تعلق قائم کر سکتے تھے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	''اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت
حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ	کرتے ہیں، اپنی بیویوں اور لونڈیوں
اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ، فَاِنَّهُمْ	کے سوا، اِس لیے کہ اُن کے معاملے
غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ، فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ	میں اُن پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ ہاں،

ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ. جو اِن کے علاوہ کچھ چاہیں تو وہی حد
(المومنون۲۳:۵-۷) سے بڑھنے والے ہیں۔''

آیت کا مدعا یہی ہے، مگر اِس سے بعض فقہا نے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ اِس میں بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا قضاے شہوت کے تمام طریقے حرام قرار دیے گئے ہیں، لہٰذا زنا، عمل قوم لوط اور وطی بہائم کی طرح جلق 'masturbation' کی مختلف صورتیں بھی قطعاً حرام ہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو رعایت اِس معاملے میں دی جاسکتی ہے، وہ یہ ہے کہ اِن کی حرمت زنا اور عمل قوم لوط اور وطی بہائم کی بہ نسبت کم تر سمجھی جائے اور اِن گناہوں سے بچنے کے لیے لوگ اگر اِس طریقے سے اپنے جوش طبع کی تسکین کرلیں تو اُن کے حق میں توقع رکھی جائے کہ شاید اللہ تعالیٰ اُنھیں سزا نہ دے۔

ہمارے نزدیک یہ استدلال عربیت کی رو سے نہایت کمزور، بلکہ غلط ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں 'عَلٰی' 'حٰفِظُوْنَ' کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا، اِس لیے یہاں لازماً تضمین ہے اور 'حٰفِظُوْنَ' کے بعد 'عن الوقوع علی احد' یا اِس کے ہم معنی الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں۔ چنانچہ مستثنیٰ منہ استمنا کے طریقے نہیں، بلکہ افراد ہیں جن سے کوئی شخص جنسی تعلق قائم کرسکتا ہے۔ اِس سے واضح ہے کہ آیت کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا قضاے شہوت کا کوئی طریقہ اختیار کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ ہوں گے کہ بیویوں اور مملوکہ عورتوں کے سوا کسی سے قضاے شہوت کرنا جائز نہیں ہے۔ آیت کی صحیح تاویل یہ ہے، لہٰذا پورے اطمینان کے ساتھ کہا جاسکتا

ہے کہ قرآن مجید میں کوئی نص صریح یا قاعدۂ کلیہ ایسا نہیں ہے جس کے تحت استمنا بالید کو حرام یا مکروہ ٹھیرایا جائے۔ یہی صورت حدیث کی ہے۔ اِس کے ذخائر بھی اِس کے متعلق کسی ایسی روایت سے خالی ہیں جو محدثین کے نزدیک قابل قبول ہو۔ چنانچہ اِس معاملے میں صحیح مسلک وہی ہے جو امام ابن حزم نے اپنی کتاب ''المحلیٰ'' (۲۲۱/۱۳) میں پورے دلائل کے ساتھ پیش فرمایا ہے، پھر سند کے ساتھ بتایا ہے کہ حسن بصری، عمرو بن دینار، زیاد ابوالعلا اور مجاہد جیسے بزرگ بھی استمنا بالید کی اباحت کے قائل تھے جو اِس طرح کی چیزیں بالعموم صحابۂ کرام ہی سے روایت کرتے ہیں۔

اعضا کی پیوندکاری

پچھلی دو صدیوں میں سائنس نے جو کرشمے دکھائے اور انسانیت کے لیے جو سہولتیں پیدا کی ہیں، اُن میں سے ایک غیر معمولی چیز یہ ہے کہ سرجری کے ذریعے سے انسان کے ناقص اعضا کسی دوسرے شخص کے تندرست اعضا سے تبدیل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ معاملہ زندگی میں بھی ہو سکتا ہے اور موت کے بعد بھی۔ اِس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ دین وشریعت کی رو سے کیا یہ جائز ہے کہ کوئی شخص زندگی میں اپنا کوئی عضو کسی کو ہبہ کر دے یا وصیت کرے کہ مرنے کے بعد یہ عضو دوسرے شخص کو دیا جا سکتا ہے؟

اِس سوال کا جواب اثبات میں ہونا چاہیے، اِس لیے کہ قرآن وحدیث میں بظاہر کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اِس میں مانع ہو، مگر برصغیر کے علما بالعموم اِسے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اِس معاملے میں دو باتیں کہی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ انسان اپنے جسم کا مالک نہیں ہے، لہٰذا اُس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ مرنے سے پہلے اپنے اعضا کسی کو دینے کی وصیت کرے۔ آدمی کا جسم اُسی وقت تک اُس کے تصرف میں ہے، جب تک وہ خود اُس جسم میں رہتا ہے، اُس سے نکل جانے کے بعد اُس کا اِس جسم پر کوئی حق باقی نہیں رہتا کہ وہ اُس کے بارے میں وصیت کرے اور اُس کی یہ وصیت نافذ العمل قرار دی جائے۔

دوسری یہ کہ انسانی لاش کی حرمت قائم رہنی چاہیے۔ زندہ انسان اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اُن کا فرض ہے کہ مرنے والے کا جسم پورے احترام کے ساتھ دفن کر دیں۔ لاش کو چیرنا پھاڑنا یا اُس کا کوئی عضو کاٹ لینا اُس کی بے حرمتی ہے اور دنیا کا کوئی اخلاقی نظام اِس کی اجازت نہیں دے سکتا۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں باتیں محل نظر ہیں۔

اِس میں شبہ نہیں کہ ہر چیز کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے، مگر اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں انسان کو دی ہیں، حدود الٰہی کے اندر وہ اُن میں ہر طرح کے تصرف کا حق رکھتا ہے۔ چنانچہ عزت، آبرو، اہل وعیال اور اپنے وطن اور دین کے لیے وہ اپنی جان قربان کر دیتا ہے، اپنا مال لٹا دیتا ہے، اور یہ جانتے ہوئے کہ

مارا جاؤں گا یا اپنا کوئی عضو کھو دوں گا، اِنھی مقاصد کے لیے اپنے آپ کو جنگ میں جھونک دیتا ہے، آگ میں کود پڑتا ہے، بڑے سے بڑے خطرے کو انگیز کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اِن تصرفات کو نفس اور مال کے جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ سے تعبیر کیا ہے اور اپنے ماننے والوں کو جگہ جگہ ترغیب دی ہے کہ اپنی یہ چیزیں وہ اِن مقاصد کے لیے خرچ کریں۔ اِس سے واضح ہے کہ قرآن اِس حق تصرف کو تسلیم کرتا ہے۔

انسان کا حق وصیت اِسی حق تصرف کا لازمہ ہے۔ چنانچہ ہم جس طرح یہ حق رکھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اپنے مال کے بارے میں وصیت کریں، اِسی طرح یہ حق بھی رکھتے ہیں کہ اپنے جسم کی تجہیز و تکفین اور تدفین کے بارے میں وصیت کر دیں۔ اپنا کوئی عضو کسی شخص کو دینے کی وصیت بھی اِسی قبیل سے ہے۔ پہلی سب چیزیں اگر جائز ہیں اور آدمی کے اپنے جسم سے نکل جانے کے باوجود ہو سکتی ہیں تو اعضا کے بارے میں وصیت کو ناجائز کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟

لاش کی بے حرمتی کو بھی اِسی طرح دیکھنا چاہیے۔ اِس کا تعلق نیت اور محرکات سے ہے۔ کسی شخص کے عضو کو نقصان پہنچانا جرم ہے۔ قرآن میں اِس کے لیے قصاص اور دیت کے احکام دیے گئے ہیں، لیکن مریض کی اجازت سے ایک ڈاکٹر اُس کا ہاتھ یا پاؤں کاٹ دیتا ہے تو کوئی شخص بھی اُسے مجرم قرار نہیں دیتا۔ پھر مقتول کی لاش پر گھوڑے دوڑانے یا اُس کا مثلہ کرنے اور تحقیق و تفتیش کے لیے اُس کا پوسٹمارٹم کرنے

میں فرق کیوں نہ کیا جائے؟ آدمی اپنا مال کسی ضرورت مند کو دینے کی وصیت کرے تو یہ ایک نیکی کا کام ہے، اِسی طرح اپنا کوئی عضو کسی ضرورت مند کو دینے کی وصیت کرے تو اِسے بھی نیکی ہی کہنا چاہیے۔ اِس کی تعمیل کو لاش کی بے حرمتی کیوں سمجھا جائے؟

ضبط ولادت

بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن اُن کی پیدایش کا معاملہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ جس ماں باپ کے لیے اور جتنی تعداد میں چاہتا ہے، اُنھیں براہ راست آسمان سے نازل کر دیتا ہے۔ اُن کی پیدایش انسان کی وساطت سے اور اُس کے ارادے، فیصلے اور اقدام کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ انسان کے بارے میں یہ بات محتاج وضاحت نہیں ہے کہ اُس کے خالق نے اُسے عقل وشعور سے نوازا اور ارادہ واختیار عطا فرمایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں تقاضا کرتی ہیں کہ اپنے ہر فیصلے سے پہلے وہ اُس کے نتائج وعواقب کا جائزہ لے، علم وعقل کی روشنی میں معاملے کو سمجھے اور اِس کے بعد اقدام کرے۔ اِسے باغبان کی مثال سے سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ* (یہ کھیتی تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں)؟ مدعا یہ ہے کہ باغ اور کھیتیاں تم نہیں، بلکہ خدا اگاتا ہے۔ لیکن اِس کے معنی کیا یہ ہیں کہ باغبان کا کام صرف

* الواقعہ ۵۶: ۶۴۔

بیج بکھیر دینا یا پنیری جما دینا ہے؟ ہر شخص مانے گا کہ ہرگز نہیں، اُس کی ذمہ داری ہے کہ باغ لگانے سے پہلے دیکھے کہ جو درخت وہ بونے جا رہا ہے، اُن کی کاشت، نگہداشت اور اُن میں پھل آنے کے بعد اُسے درختوں سے اتارنے اور منڈی تک پہنچانے کے اخراجات ولوازم کا تحمل کیا اُس کے لیے ممکن ہے؟ اُس نے زمین تیار کر لی ہے؟ درخت لگاتے وقت اُن کی ضرورت کے لحاظ سے زمین میں فاصلہ چھوڑ دیا ہے؟ اُن کے پھلوں کی منڈی میں مانگ بھی ہے یا نہیں، اِس کے لیے ضروری معلومات فراہم کر لی ہیں؟ یہ سب چیزیں دیکھنے کے بعد فیصلہ کرے کہ اُسے کیا بونا ہے اور کب بونا ہے اور کچھ بونا بھی ہے یا نہیں؟ ضبط ولادت کے معاملے میں لوگ جائز اور ناجائز کی بحث کرتے ہیں، دراں حالیکہ اِن سب چیزوں کو دیکھنا جس طرح باغبان کے لیے ضروری ہے، اِسی طرح بچے کے والدین کے لیے بھی ضروری ہے۔ اِنھیں باغبان نہیں دیکھے گا تو وہ بھی اِس کے نتائج بھگتے گا اور والدین نہیں دیکھیں گے تو وہ بھی بھگتیں گے۔

ہمارے معاشرے میں اِس کی مثالیں جگہ جگہ دیکھ لی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ بچے کی تمہید باندھنے سے پہلے والدین اِس بات کا جائزہ لیں کہ ماں بچے کا تحمل کر سکتی ہے؟ اُس کی صحت اِس قابل ہے کہ پیدایش اور پرورش کا بوجھ اُٹھا سکے؟ اِس سے پہلے اگر کوئی بچہ ہے تو اُس سے اِس حد تک فارغ ہو چکی ہے کہ دوسرے بچے کی نگہداشت کر سکے؟ اپنے زمانے اور حالات کے لحاظ سے ماں باپ کیا بچے کی نشوونما اور تعلیم وتربیت کے لیے وقت، فرصت اور ضروری وسائل رکھتے ہیں؟ اِن سوالوں کا

جواب اگر نفی میں ہے تو ضبطِ نفس سے کام لینا چاہیے یا منع حمل کا کوئی طریقہ اختیار کر لینا چاہیے، مگر بچے کی تمہید ہرگز نہیں باندھنی چاہیے۔

تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہمارا یہ فیصلہ خدا کے کسی فیصلے کو روک سکتا ہے۔ اُس کی حکمت کا تقاضا اگر یہ ہے کہ بچے کو دنیا میں آنا ہے تو وہ آ کر رہے گا۔ ہماری یہ تدبیریں اُس کے قانون کی پیروی کے لیے ہیں، اُس کے کسی فیصلے کو روکنے کے لیے نہیں ہیں۔ بیماری خدا کے اذن سے آتی ہے، مگر حفظانِ صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی کی جائے تو عام قانون یہی ہے کہ بیماری آئے گی۔ شفا خدا کے ہاتھ میں ہے، مگر علاج نہ کیا جائے تو عام قانون یہی ہے کہ بیماری بڑھے گی۔ رزق خدا ہی دیتا ہے، مگر عام قانون یہی ہے کہ اُس کے لیے جدوجہد کی جائے تو ملتا ہے۔ یہ دنیا عالم اسباب ہے اور انسان کو یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ اپنی عقل کے مطابق اِن اسباب کو استعمال کرے۔ خدا کی تقدیر یہاں بہت سے معاملات میں ہمارے ارادوں، فیصلوں اور اقدامات سے متعلق ہوتی ہے۔ سیدنا عمر نے طاعون کی جگہ سے بھاگنے کی ہدایت کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم خدا کی تقدیر سے خدا کی تقدیر کی طرف جا رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب آپ سے منع حمل کی ایک تدبیر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے اِسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ابوسعید خدری کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:

مامن کل الماء یکون الولد، ''ہر نطفے سے اولاد نہیں ہوتی، مگر اللہ

واذا اراد اللّٰہ خلق شیٔ لم یمنعہ شیٔ. (مسلم، رقم ۱۴۳۸) — جب کسی چیز کو پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اُسے کوئی روک نہیں سکتا۔''

مباشرت کے حدود

دین کا مقصد تزکیہ ہے۔ وہ ہرگز پسند نہیں کرتا کہ بیوی کے ساتھ منہ یا دبر کے راستے سے جنسی تعلق قائم کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ عورتوں سے ملاقات لازماً اُسی راستے سے ہونی چاہیے جو اللہ نے اُس کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'فَاْتُوْھُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَکُمُ اللّٰہُ*' (تو اُن سے ملاقات کرو، جہاں سے اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے)۔ یہ چیز بدیہیات فطرت میں سے ہے اور اِس پہلو سے، لاریب خدا ہی کا حکم ہے۔ اگر کوئی شخص اِس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ درحقیقت خدا کے ایک واضح، بلکہ واضح تر حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے، اور اِس پر یقیناً اُس کے ہاں سزا کا مستحق ہوگا۔

یہ آیت جہاں آئی ہے، قرآن نے یہی بات اِس کے بعد کھیتی کے استعارے سے واضح فرمائی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

---

*البقرہ ۲: ۲۲۲۔

''عورتوں کے لیے کھیتی کے استعارے میں ایک سیدھا سادہ پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لیے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے، نیز بیج کھیت ہی میں ڈالے جاتے ہیں، کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے، کوئی کسان اِس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا، اِسی طرح عورت کے لیے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایام ماہواری کے زمانے میں یا کسی غیر محل میں اُس سے قضاے شہوت نہ کی جائے، اِس لیے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جماع اور غیر آمادگی کا زمانہ ہوتا ہے، اور غیر محل میں مباشرت باعث اذیت و اضاعت ہے۔ اِس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لیے اِس کا ارتکاب جائز نہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۲۷)

اِس کے بعد 'فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ*' (لہٰذا تم اپنی اِس کھیتی میں جس طرح چاہے، آؤ) کی وضاحت میں اُنھوں نے لکھا ہے:

''...(اِس) میں یہ بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اُس آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی کے مالک کو اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں حاصل ہوتی ہے، اور دوسری اُس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی والا اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اِس دوسری چیز کی طرف 'حَرْثَ' کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف 'اَنّٰى شِئْتُمْ' کے الفاظ۔ وہ آزادی اور یہ پابندی، یہ دونوں چیزیں مل کر اُس رویے کو

*البقرہ ۲: ۲۲۳۔

متعین کرتی ہیں جو ایک شوہر کو بیوی کے معاملے میں اختیار کرنا چاہیے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون وسرور فریقین کے اِس اطمینان میں ہے کہ اُن کی خلوت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید، کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اِس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش وسرور کے اِس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اِس نشہ سے سرشار ہو، لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اُس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں، بلکہ اُس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں، بلکہ اُس کی اپنی کھیتی ہے، اِس وجہ سے وہ اِس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان، جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے، لیکن اِس باغ کا باغ ہونا اور کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے۔ اِس کے کسی آنے میں بھی اِس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۲۷)

یہ ہدایات کس درجہ اہمیت رکھتی ہیں؟ قرآن نے سورۂ بقرہ کی اِنھی آیات میں اِسے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ* (بے شک، اللہ توبہ کرنے والوں اور پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے) کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ آیت کے اِس حصے کی وضاحت استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس طرح کی ہے:

''...توبہ اور تطہر کی حقیقت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ توبہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کا نام ہے اور تطہر اپنے ظاہر کو نجاستوں اور گندگیوں سے پاک

*البقرہ ۲: ۲۲۲۔

کرنا ہے۔ اِس اعتبار سے دونوں کی حقیقت ایک ہوئی اور مومن کی دونوں خصلتیں اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ اِس کے برعکس جو لوگ اِن سے محروم ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں۔ یہاں جس سباق میں یہ بات آئی ہے، اُس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو لوگ عورت کی ناپاکی کے زمانے میں قربت سے اجتناب نہیں کرتے یا قضاے شہوت کے معاملے میں فطرت کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں، وہ اللہ کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔'' (تدبر قرآن ۱/ ۵۲۶)

www.ghamidi.net

بیمہ

بیمہ یا انشورنس ایک نوعیت کا عقد معاونت ہے جس میں لوگ ایک متعین رقم بالاقساط اِس لیے ادا کرتے ہیں کہ اُن میں سے کسی کے جان و مال کو کوئی نقصان پہنچے تو لوگوں کی جمع شدہ رقوم سے ایک مقررہ قاعدے کے مطابق اُس کے نقصان کا ازالہ کر دیا جائے۔ یہ رقوم کبھی واپس نہیں کی جاتیں، بلکہ جو افراد یا ادارے یہ ذمہ داری اٹھاتے ہیں، اُنھیں اِس عقد معاونت کے شرکا یہ حق بھی دیتے ہیں کہ اپنی اِس خدمت کے معاوضے میں اُن کی جمع شدہ رقوم کو وہ جس طرح چاہیں، استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ ایک غیر معمولی اسکیم ہے جو نقصان کے ازالے اور مشکل حالات میں لوگوں کی معاونت کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ اِس کی افادیت اب ہر جگہ تسلیم کی جاتی ہے۔

قبیلہ، برادری اور عاقلہ کا نظم ختم ہو جانے کے بعد یہ ایک بہترین متبادل ہے جو دور حاضر کی معیشت نے دنیا کو فراہم کیا ہے۔ اِس میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی، لیکن علما بالعموم اِسے حرام قرار دیتے ہیں۔ اُن کی طرف سے جو اعتراضات اِس اسکیم پر کیے گئے ہیں، وہ یہ ہیں:

۱۔ بیمہ کے ادارے کسی نقصان کی صورت میں جو رقم ادا کرتے ہیں، وہ ادا شدہ قسطوں سے بالعموم زیادہ ہوتی ہے۔ یہ سود ہے اور سود اسلامی شریعت میں ممنوع ہے۔ پھر یہ ادارے آگے بھی اپنے اموال سودی کاروبار میں لگاتے ہیں جس کا کچھ نہ کچھ حصہ اُن لوگوں کو بھی پہنچ جاتا ہے جنھیں ازالۂ نقصانات کے لیے رقوم ادا کی جاتی ہیں۔

۲۔ بیمہ کرانے والے بارہا معمولی رقم کے عوض موت یا حوادث یا نقصان کی صورت میں بڑی بڑی رقمیں وصول کر لیتے ہیں۔ یہ جوا ہے اور جوا بھی اسلامی شریعت میں ممنوع ہے۔

۳۔ بیمہ جس چیز کے لیے کیا جاتا ہے، اُس کا وجود متحقق نہیں ہوتا، محل عقد بھی غیر واضح ہوتا ہے اور بیمہ کرانے والے یہ بھی نہیں جانتے کہ اُنھیں کب تک اور کتنی اقساط دینا پڑیں گی۔ فقہا کی اصطلاح میں یہ تینوں چیزیں بالترتیب غرر، غبن اور جہالت کہلاتی ہیں جن کے ساتھ کوئی معاہدہ جائز نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس طرح کے معاہدات سے منع فرمایا ہے۔

یہ تینوں اعتراضات، اگر غور کیجیے تو بالکل بے بنیاد ہیں۔

پہلا اِس لیے کہ بیمہ میں جو رقوم بالاقساط ادا کی جاتی ہیں، وہ کوئی قرض نہیں ہوتیں۔ اپنی معاونت کے وعدے پر وہ دوسروں کی معاونت کے لیے دی جاتی ہیں، لہٰذا کبھی واپس نہیں لی جاتیں۔ بیمہ کے ادارے اُنھیں سودی کاروبار میں لگاتے ہیں تو اپنے حق استعمال کی بنا پر لگاتے ہیں۔ اِس کی کوئی ذمہ داری بیمہ کرانے والوں پر عائد نہیں ہوتی۔ بیمہ جس معاملے کے لیے کرایا جاتا ہے، وہ پیش آجائے تو جو کچھ ملتا ہے، معاہدے کی رو سے دوسروں کی جمع شدہ رقوم سے ملتا ہے۔ بیمہ کی حقیقت یہی ہے اور اِسے اِسی لحاظ سے دیکھنا چاہیے۔

دوسرا اِس لیے کہ جوا ایک کھیل اور نری قسمت آزمائی ہے۔ اِس میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں، وہ ازالۂ نقصانات کے لیے ایک دوسرے کی معاونت کا کوئی نظم قائم کرنے کے لیے شریک نہیں ہوتے۔ دونوں کی حقیقت الگ ہے اور دین کے احکام ادنیٰ مماثلت پر نہیں، بلکہ اشیا کی حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور اِسی پر مبنی ہونے چاہییں۔

تیسرا اِس لیے کہ غرر، غبن اور جہالت سے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات سدذریعہ کے طور پر اور بیع وشرا میں رفع نزاعات کے لیے ہیں۔ بیمہ بیع وشرا کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ یہ باہمی تعاون کی ایک اسکیم ہے جس کا اہتمام کرنے والے افراد اور اداروں کو اُن کی خدمت کے معاوضے میں جمع شدہ رقوم کو استعمال کرنے کا حق دیا جاتا ہے۔ اِس کی اِس حقیقت کو نظر انداز کر کے اِس پر کوئی حکم لگانا کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

محمد اور احمد

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احمد بھی ہے اور محمد بھی۔ قرآن مجید میں ہر جگہ آپ کا ذکر محمد کے نام سے ہوا ہے، لیکن سورۂ صف میں حضرت مسیح کی جو بشارت آپ کے بارے میں نقل ہوئی ہے، اُس میں آپ کا نام احمد آیا ہے۔ ہمارے نزدیک اِس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کا جو نام آپ کی والدہ محترمہ نے رکھا وہ احمد ہی ہے۔ ابن سعد میں ہے کہ زمانۂ حمل میں آپ کی والدہ کو ہدایت کی گئی کہ وہ ہونے والے بچے کا نام احمد رکھیں۔ آپ کا نام محمد آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی پیدایش کے بعد رکھا۔ حضرت مسیح کی بشارت چونکہ آپ کی نبوت کی ایک قطعی دلیل بھی ہے، اِس وجہ سے اُس میں یہی موزوں ہوا کہ آپ کا ذکر اُس نام سے ہو جو آپ کی والدہ نے رکھا اور جو اِس اعتبار سے آپ کا اصلی نام ہے۔

رہی یہ بات کہ قرآن مجید میں ہر جگہ آپ کا ذکر محمد کے نام سے کیوں ہوا ہے تو اِس کا سبب یہ ہے کہ 'محمد' معنوی اعتبار سے لقب ہے۔ چنانچہ آپ کے شرف و اعزاز کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کا ذکر اِسی سے کیا اور امت میں بھی آپ کا تذکرہ زیادہ تر اِسی نام سے ہوتا ہے۔

[۱۹۸۹ء]

زبان کا ایک اسلوب

قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے، اُس کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ جب ایک مذکر اور مونث کو جمع کر کے اُن کے لیے کوئی منصوب یا مجرور ضمیر لانا پیش نظر ہو تو وہ جس طرح عام قاعدے کے مطابق مثنیٰ صورت میں آتی ہے، اِسی طرح اگر معنی میں ابہام کا اندیشہ نہ ہو اور مذکر و مونث، دونوں کی طرف ضمیر کے رجوع کے قرائن بالکل واضح ہوں تو واحد مونث بھی آ سکتی ہے، بلکہ کلام عرب کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس طرح کے مواقع پر یہ بالعموم واحد مونث ہی آتی ہے۔

زبان کا یہ قاعدہ اگرچہ سیبویہ، زمخشری، ابن ہشام اور دوسرے ائمۂ نحو نے بیان نہیں کیا، لیکن اِس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ زبان کے جو قواعد و اسالیب بھی نحو و اعراب کے علما نے بیان کیے ہیں، وہ اُنھیں کہیں باہر سے نہیں لائے، اُن کا ماخذ کلام عرب اور قرآن مجید ہی ہے۔ زبان قواعد سے نہیں، قواعد زبان سے بنتے ہیں۔ کسی بھی زبان کے بولنے والے جو کچھ بولتے، لکھتے ہیں، اُن کی گفتگوؤں اور تحریروں کے تتبع سے اِس زبان کے جاننے والوں کے لیے اسالیب و قواعد اخذ کیے جاتے ہیں اور اخذ قواعد کا یہ عمل کہیں رک نہیں جاتا، ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اہل تحقیق اگلوں کے اخذ کیے ہوئے

قواعد پر تنقید کر کے اُن کی غلطیاں واضح کرتے اور اہل زبان کے کلام کے تتبع سے نئے نئے قواعد اور نئے نئے اسالیب دریافت کرتے رہتے ہیں۔ جب بھی کوئی نیا اسلوب یا نیا قاعدہ بیان کیا جاتا ہے، اُس کی دلیل کے طور پر فقط یہ بات کافی سمجھی جاتی ہے کہ اِس کے شواہد اہل زبان کے مستند کلام میں موجود ہیں۔ کتنے اسالیب ہیں جو سیبویہ اور خلیل بن احمد کے ہاں نہیں ملتے، لیکن مبرد، فرا، زمخشری، ابن ہشام اور دوسرے علما نے اُنھیں اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے اور اُن کے دلائل کی بنا پر وہ بعد میں زبان کے مسلمہ اسالیب قرار پائے ہیں۔ دور کیوں جایئے، ماضی قریب میں امام حمید الدین فراہی اور استاذ امام امین احسن اصلاحی نے کتنے ہی نئے اسالیب دریافت کیے ہیں اور اُن کی بنیاد پر قرآن مجید کی بہت سی مشکلات حل کی ہیں۔ اِس لیے کسی نئے قاعدے یا نئے اسلوب کو محض اِس وجہ سے ناقابل اعتنا نہیں ٹھیرایا جا سکتا کہ وہ نحو و اعراب کی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ ہاں، البتہ اصل ماخذ یعنی اہل زبان کے کلام کی بنیاد پر اُس پر تنقید کی جا سکتی اور اُسے ناقابل قبول قرار دیا جا سکتا ہے۔

زبان کا جو قاعدہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، وہ بھی نحو کی کتابوں میں تو، بے شک بیان نہیں ہوا، لیکن قرآن مجید اور کلام عرب میں اِس کے شواہد موجود ہیں۔ ہم چند مثالیں پیش کر کے اُن کی وضاحت کیے دیتے ہیں تاکہ علماے فن اُن پر غور کے بعد اِس قاعدے کی صحت و عدم صحت کے بارے میں کوئی راے قائم کر سکیں۔

لبید بن ربیعہ العامری، اپنے مشہور معلقہ میں اونٹنی کی تشبیہات بیان کرتے ہوئے،

ایک جنگلی گدھے اور گدھی کا ذکر کرتا ہے جو طویل عرصے تک وادی ثلبوت میں ٹھہرے رہے اور جمادی الاخریٰ کا مہینا گزر جانے کے بعد موسم گرما کے آغاز میں اِس وادی سے نکلے۔ اُس کے اشعار ہیں:

حتی اذا سلخا جمادی ستة جزآ فطال صیامه و صیامها
رجعا بامرهما الی ذی مرة حصد و نجح صریمة ابرامها
ورمی دوابرها السفا و تهیجت ریح المصایف سومها و سهامها

''وہ طویل عرصے تک وادی ثلبوت میں مقیم رہے، یہاں تک کہ جب جمادی الاخریٰ کا مہینا بھی اُنھوں نے اِس طرح گزار دیا کہ پانی کے بجائے گھاس ہی پر اکتفا کی اور دونوں ایک عرصے تک چلنے پھرنے سے رکے رہے تو اُنھوں نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے معاملے کے بارے میں فیصلہ کیا ـــــ درحقیقت مقصد تو اُس کے لیے مضبوط عزم ہی سے پورا ہوتا ہے ـــــ اور بہمی کے کانٹے اُن دونوں کے سموں میں چبھنے لگے اور گرما کی ہوا چلنے لگی اور اُس کی لو تیز ہوگئی۔''

اب دیکھیے، ذکر گدھے اور گدھی کا ہو رہا ہے۔ 'سلخا'، 'جزآ'، 'رجعا' سب میں ضمیر مرفوع گدھے اور گدھی، دونوں کے لیے اور صیغہ کے اعتبار سے مثنیٰ ہی ہے، لیکن جب پاؤں میں کانٹے چبھنے کا تذکرہ ہوا اور اِس کے لیے ضمیر مجرور لانا پڑی تو 'رمی دوابرها' میں یہ گدھے اور گدھی دونوں کے لیے واحد مونث ہی آئی ہے۔ اِن اشعار میں اِس ضمیر کا مرجع آپ کسی مصدر کو قرار دے سکتے ہیں نہ پچھلے جملے میں مذکور

کسی بات کے مفہوم کو۔ آپ اِسے صرف گدھی کی طرف بھی نہیں لوٹا سکتے، اِس لیے کہ کانٹے چبھنے کا تذکرہ یہاں جس پہلو سے ہوا ہے، اُس میں سے گدھے کے استثنا کی کوئی صورت بھی شعر کے مفہوم سے آنکھیں بند کیے بغیر نکالنا ممکن نہیں ہے۔

حماسی شاعر عبداللہ بن الزبیر الاسدی کا شعر ہے:

سمعت بکاء باکیة و باك ابان الدهر واحدها الفقیدا

''تو (ہند اور رملہ کو ماتم کناں دیکھتا تو) اُس رونے والے اور رونے والی کی آہ و بکا سنتا جن کا اکلوتا بیٹا گم ہو گیا ہو، زمانے نے اُسے اُن سے جدا کر دیا ہو۔''

یہاں بھی دیکھ لیجیے، 'باکیة' اور 'باك' کے لیے ضمیر واحد مونث ہی آئی ہے، 'واحدها' کے بجاے 'واحدهما' نہیں آیا۔

قرآن مجید میں ہے:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ، يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ. (التوبہ ۹:۳۴-۳۵)

''اور جو لوگ سونا اور چاندی ڈھیر کر رہے ہیں اور اپنے اِس سونے اور چاندی کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، اُن کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔ وہ دن جب دوزخ میں اُن کے اِس سونے اور چاندی پر آگ دہکائی جائے گی، پھر اُس سے

اُن کی پیشانیاں، اُن کے پہلو اور اُن
کی پیٹھیں داغی جائیں گی۔''

اِس آیت میں سونے اور چاندی دو چیزوں کا ذکر ہوا ہے، لیکن اِن دونوں کے لیے 'یُنفِقُونَھَا'، 'یُحمٰی عَلَیھَا' اور 'فَتُکوٰی بِھَا' میں جہاں کہیں بھی ضمیر منصوب یا مجرور استعمال کرنے کی ضرورت پڑی ہے، اُسے واحد مونث ہی استعمال کیا گیا ہے۔ زمخشری اور دوسرے ائمۂ تفسیر نے اُس کا مرجع 'ذھب وفضة' کے معنی مقدر، یعنی دنانیر ودراہم کو قرار دیا ہے، لیکن اُن کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم اِس آیت پر بحث کر کے واضح کر دیتے کہ یہاں یہ ضمیر 'ذھب و فضة' کے الفاظ کے بجاے اُن کے کسی ہم معنی لفظ یا الفاظ کی طرف لوٹائی جائے تو اِس سے آیت کے معنی کا حسن ہی مجروح نہیں ہوتا، وہ تصویر بھی دھندلا جاتی ہے جو 'یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ، فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَ جُنُوْبُھُمْ وَ ظُھُوْرُھُمْ' کے الفاظ میں کھینچی گئی ہے۔

ہمارے نزدیک سورۂ جمعہ کی آیت 'وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَھْوَا نِ انْفَضُّوْٓا اِلَیْھَا'[1] (اور جب کوئی تجارت یا کھیل کی چیز پاتے ہیں تو اُس کی طرف ٹوٹ پڑتے ہیں) میں چونکہ حرف 'او' تخییر یا 'اثبات احد المذکورین' کے بجاے تقسیم کے لیے ہے، یعنی اُن میں سے کچھ تجارت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور کچھ کھیل تماشے کی طرف، اور اِس

[1] ۶۲: ۱۱۔

میں بھی معطوف اور معطوف علیہ جمع کے حکم ہی میں ہوتے ہیں، اِس لیے ایک مذکر اور ایک مونث میں سے 'لھو' یعنی مذکر اگرچہ ضمیر کے قریب واقع ہوا ہے، 'الیھا' میں ضمیر مجرور واحد مونث ہی استعمال ہوئی ہے اور ہماری رائے میں اِس کا مرجع بھی 'تجارۃ' اور 'لھو'، دونوں ہی ہیں۔

[۱۹۸۲ء]

www.ghamidi.net

www.ghamidi.net

نقد و نظر

www.ghamidi.net

علم و تحقیق کا المیہ

اِس معاشرے میں ہر چیز گوارا کی جاتی ہے، لیکن علم و تحقیق کا وجود کسی حال میں گوارا نہیں کیا جاتا۔ لوگ بے معنی باتوں پر داد دیتے، خرافات پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کرتے، جہالت کے گلے میں ہار ڈالتے اور حماقت کی راہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں، مگر کسی علمی دریافت اور تحقیقی کارنامے کے لیے، بالخصوص اگر وہ دین سے متعلق ہو تو اُن کے پاس اینٹ پتھر کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہاں سب سے بڑا مرض عامیانہ تقلید کا مرض ہے۔ ہر وہ چیز جسے لوگوں نے اختیار کیا ہوا ہے؛ جو پہلے سے چلی آ رہی ہے؛ جس سے لوگوں کے جذبات وابستہ ہیں؛ جو اُن کی شناخت بن گئی ہے؛ جو اُن کے لیے ایک روایت کی حیثیت رکھتی ہے، وہ اگرچہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو اور اُس نے حقیقت کا چہرہ کتنا ہی مسخ کیوں نہ کر دیا ہو اور وہ اللہ کے کسی صریح حکم اور اُس کے رسول کی کسی واضح سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، لوگ اُس پر کوئی تنقید سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اُنھیں اِس بات سے کوئی

دل چسپی نہیں ہوتی کہ کہنے والے نے اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دلیل کیا پیش کی ہے۔ اُن کی ساری تگ و دو کا محور صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی اُس روایت کو بچانے میں کامیاب ہو جائیں۔ چنانچہ وہ تنقید کرنے والے کے دلائل سے گریز کر کے، اُس کے کلام میں تحریف کر کے، اُس کے مدعا کو تبدیل کر کے، اُس کی شخصیت کو مجروح کر کے، اُس کا مذاق اڑا کر، غرض یہ کہ ہر طریقے سے حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

اِس معاملے میں سب سے برا رویہ اُن لوگوں کا ہوتا ہے جو بس شد بد علم کی بنا پر مذہبی پیشواؤں کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں اور اپنے آپ کو اُن سے زیادہ اُن کے عقائد و نظریات کا محافظ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص اخنس بن شریق کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اصلاً قبیلۂ ثقیف سے تعلق رکھتا تھا، لیکن اِس بات کا مدعی تھا کہ وہ بنی زہرہ میں سے ہے۔ چنانچہ جاہلی روایات کی حفاظت میں وہ اُن لوگوں سے کہیں زیادہ سرگرم ہوا جو خود اُن روایات کے امین تھے۔

اِس طرح کے لوگ چونکہ احساس کہتری کے مریض اور خود اعتمادی سے محروم ہوتے ہیں، اِس وجہ سے دوسرے مذہبی پیشوا اگر کسی رائے کو غلط کہیں تو یہ اُسے گمراہی کہتے ہیں، وہ اُسے گمراہی قرار دیں تو یہ اُسے فتنہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِنھیں اِس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ وہ جہاں جاتے،

جو کچھ پڑھتے اور جس سے ملتے ہیں، اپنی شخصیت کی تعمیر کے لیے کچھ مسالہ تلاش کرنے اور اپنی سیادت کے لیے کوئی راستہ ڈھونڈنے کے سوا اُنھیں کسی چیز سے دل چسپی نہیں ہوتی۔ وہ بحث میں بھی علمی محاکے کا طریقہ اختیار نہیں کرتے، بلکہ اپنا سا راز ور لینا، پکڑنا، جانے نہ دینا کی قسم کے نعرے بلند کر کے مذہبی پیشواؤں کو اِس بات کی طرف متوجہ کرنے پر صرف کرتے ہیں کہ علم و تحقیق کی ہر شمع جس قدر جلد ممکن ہو بجھا دی جائے۔ وہ اگر زندگی کے کسی مرحلے میں کبھی کسی ایسے شخص کی صحبت میں چند دن گزار لینے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں جو یوحنا بپتسمہ دینے والے کی طرح اونٹ کے بالوں کا لباس پہنتا، ٹڈیاں اور جنگلی شہد کھاتا اور بادشاہوں کی طرح کلام کرتا ہے تو باقی زندگی اِس تشویش میں گزار دیتے ہیں کہ لوگ کہیں اُنھیں بھی اِس مرد حر کا ہم نوا نہ سمجھ لیں۔ وہ ہر دوسرے تیسرے دن ایک براءت نامہ شائع کرتے ہیں کہ لوگو، آگاہ رہو۔ میں اگرچہ کبھی مسیح کا ساتھی تھا، لیکن اب تم اُسے صلیب دینا چاہتے ہو تو وہ جو مرغ کے دو بار اذان دینے سے پہلے تین مرتبہ اُس کا انکار کرے گا، وہ میں ہی ہوں۔

اُن کی شخصیت ایک عجیب مجموعۂ تضادات ہوتی ہے۔ وہ اپنے پیرووں کے سامنے بڑی شان کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُنھوں نے جو رائے قائم کی ہے، دلیل کی بنا پر قائم کی ہے۔ چنانچہ کوئی شخص اگر دلیل سے اُن کی رائے کو غلط ثابت کر دے گا تو وہ بغیر کسی تردد کے اپنی غلطی ماننے کے لیے تیار ہوں گے، لیکن جب کوئی شخص اُن کے نقطۂ نظر کے خلاف برہان قاطع لے کر اُن کے سامنے آ جاتا ہے تو بے تکلف فرماتے ہیں: میاں،

دلیل کی حیثیت تو بس ایک لونڈی کی ہے جس سے جو خدمت لینا چاہو گے، وہ بجا لائے گی۔ اصلی تبدیلی تو دل کی تبدیلی ہے، اور اُس کی بارگاہ میں دلیل کی کیا حیثیت؟ وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بغیر کسی تعصب کے اُن کی بات سنیں، لیکن جب اُن کا کوئی پیرو بغیر کسی تعصب کے دوسرے کی بات سننا چاہتا ہے تو اُن کا غضب لاوے کی طرح ابلتا اور خود اُن کے وجود کی ساری غلاظتوں کو اُن کے سامنے ڈھیر کر دیتا ہے۔ وہ دوسروں کو درس دیتے ہیں کہ برے گمانوں سے بچو اور کان لگانے اور ٹوہ میں رہنے سے احتراز کرو، لیکن اپنے کسی مخالف کی کردار کشی کے لیے اُنھیں اگر کسی تنکے کا سہارا ملنے کی بھی توقع ہو تو وہ اِس کے لیے ہر پتھر کو الٹنے اور ہر وادی کو قطع کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

لیکن اِس پر شکایت کا کیا محل؟ اِس معاشرے میں جہاں صدیوں سے تحقیق و اجتہاد کی حیثیت ایک شجرِ ممنوعہ کی رہی ہے؛ جہاں وہ لوگ بھی جو بظاہر اہلِ دین اور اربابِ دانش سمجھے جاتے ہیں، علم کے جواب میں جہالت اور استدلال کے جواب میں ابتذال کی روش اختیار کرتے ہیں؛ جہاں بات کو سننے اور سمجھنے کے بجاے قائل کا نفسیاتی تجزیہ کرنے سے لوگوں کو زیادہ دل چسپی ہوتی ہے؛ جہاں ہر وہ چیز جس پر دو چار صدیاں گزر جائیں، مقدس ہو جاتی ہے؛ جہاں صحیح اور غلط کا معیار بالعموم لوگوں میں پذیرائی ہوتا ہے، وہاں اِس سے بہتر کسی رویے کی توقع آخر کی ہی کیوں جائے؟

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی حقیقتیں بالعموم اِسی طرح کے ماحول

میں مرسیح عالم پر نمودار ہوئی ہیں۔ یہ رویے نہ یوحنا و مسیح کی دعوت میں سدراہ بن سکے، نہ ابن حزم اور ابن تیمیہ سے اُن کا مقام چھین سکے، نہ سقراط کی حکمت سے دنیا کو محروم کر سکے، نہ کوپرنیکس اور گلیلیو کی دریافتوں کو چھپانے میں کامیاب ہو سکے۔ علم و تحقیق کی شمع ہمیشہ اِسی طرح روشن رہی ہے اور آنے والے زمانوں میں بھی، اگر اللہ نے چاہا تو اِسی طرح روشن رہے گی۔

[۱۹۸۷ء]

دین اور عقل

ہمارے ہاں لوگ بالعموم کہتے ہیں کہ دین کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو بس مان لینے کی چیز ہے۔ چنانچہ اِس باب میں علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ دین کے احکام اگر عقل پر مبنی ہوتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں کے اوپر مسح کرنے کا حکم نہ دیتے۔ عقل کا تقاضا یہی تھا کہ پاؤں چونکہ زیادہ تر نیچے سے گندے ہوتے ہیں، اِس لیے مسح بھی وہیں کیا جاتا۔ ہمارے نزدیک یہ نقطۂ نظر کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ قرآن مجید بالصراحت کہتا ہے کہ سارا دین عقل پر مبنی ہے۔ وہ اپنے تمام احکام و عقائد اِسی بنیاد پر انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اُس نے جو بات بھی کہی

ہے، اُس کے لیے ہر جگہ عقلی دلائل پیش کیے ہیں۔ وہ اِن دلائل سے گریز کی راہ اختیار کرنے والوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اپنی عقل سے کیوں کام نہیں لیتے۔ قرآن مجید کا مطالعہ اگر تدبر کے ساتھ کیا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انسان دین کو ماننے اور اُس کی ہدایات پر عمل کرنے کا مکلّف ہی اِس لیے ٹھیرایا گیا ہے کہ اُس کے پروردگار نے اُسے عقل کی نعمت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک بھلا چنگا آدمی جس کے کسی عضو میں کوئی نقص نہیں ہوتا، محض عقل سے محروم ہو جانے کی وجہ سے دین میں تمام ذمہ داریوں سے بری قرار دیا جاتا ہے۔ وہ باقی ہر لحاظ سے صحیح سالم ہونے کے باوجود قرآن و حدیث کی رو سے نہ روزہ و نماز کا مکلّف ہوتا ہے اور نہ اُسے کسی جرم کے ارتکاب پر سزا دی جا سکتی ہے۔

اِس میں شبہ نہیں کہ ہماری عقل بہت سے دینی حقائق خود دریافت نہیں کر سکتی، لیکن اللہ کے نبیوں کی طرف سے اُن کی وضاحت کے بعد وہ اُنھیں سمجھنے کی صلاحیت، بے شک رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھیں ماننے کا تقاضا بھی اللہ تعالیٰ نے اُسی سے کیا ہے۔

آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافت ہماری جامعات میں سائنس کے طلبہ نے دریافت نہیں کیا۔ وہ شاید اُسے دریافت کر بھی نہیں سکتے، لیکن اب وہ ہر روز اُسے سمجھتے اور جس حد تک اپنی عقل کے مطابق پاتے ہیں، بغیر کسی تردد کے مان لیتے ہیں۔ سائنس کا استاد، جب یہ نظریہ اُنھیں سمجھاتا ہے تو اُن کی عقل ہی کو خطاب کرتا ہے اور اُسی سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اِسے مانے۔

دین بھی انسان کی عقل ہی کو خطاب کرتا ہے۔ چنانچہ وہ عقل سے ماورا کوئی ہدایت عقل کو نہیں دیتا۔ اُس کی تمام ہدایات بالکل عقل کے مطابق ہیں۔

ہم نہیں سمجھتے کہ علی رضی اللہ عنہ جیسے عاقل انسان نے مسح کے بارے میں وہ بات کہی ہو گی جو اوپر بیان ہوئی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص بادنیٰ تامل سمجھ سکتا ہے کہ جرابوں پر مسح اُن کی غلاظت دور کرنے کے لیے نہیں کیا جاتا۔ اِس کی حیثیت تیمّم کی طرح محض ایک علامت کی ہے جس سے ہم ایک طرح کی ذہنی پاکیزگی حاصل کرتے ہیں۔ ہم پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی میں محض پاؤں کے اوپر ہاتھ پھیر لینے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ اِسے کسی طرح خلاف عقل قرار نہیں دیا جا سکتا۔

[۱۹۸۸ء]

قرآن کا موضوع

قرآن کے بارے میں یہ بات اُس کا ایک عام قاری بھی بہت آسانی کے ساتھ جان سکتا ہے کہ اُس کا موضوع صرف وہ حقائق ہیں جن کو ماننے اور جن سے پیدا ہونے والے تقاضوں کو پورا کرنے ہی پر انسان کی ابدی فلاح کا انحصار ہے۔ وہ اِنھی

حقائق کو انفس و آفاق اور تاریخ کے دلائل سے ثابت کرتا ہے، بنی آدم کو اِنھیں ماننے کی دعوت دیتا ہے، اِن کو جھٹلا دینے کے نتائج سے اُنھیں خبردار کرتا ہے اور اِن سے جو تقاضے پیدا ہوتے ہیں، اُن کی شرح و وضاحت کرتا ہے۔ اِن کے علاوہ کسی چیز سے اُسے بحث نہیں ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کے لیے وہ عالم طبیعی کے بارے میں بھی اگر کچھ کہتا ہے تو اُس کا بیان کبھی حقیقت کے خلاف نہیں ہوتا، لیکن اِس عالم کے متعلق جو علوم و فنون انسان کی عقل نے دریافت کیے ہیں اور جو وہ آنے والے زمانوں میں دریافت کرے گی، اُنھیں قرآن مجید کبھی زیر بحث نہیں لاتا۔ اِس طرح کی کوئی چیز سرے سے اُس کا موضوع ہی نہیں ہے۔

لیکن اِسے کیا کہیے کہ اِس امت کی تاریخ میں بارہا لوگ اِس کتاب کو اُس کی اِس اصلی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ چنانچہ اُنھوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ یہ چونکہ اللہ کی کتاب ہے، اِس لیے دنیا کے سارے علوم و فنون اِس میں لامحالہ ہونے چاہییں۔ اِس کے بعد وہ اپنے اِس مقدمے کو ثابت کرنے کے لیے اِس بات کے درپے ہوئے کہ کسی طرح اِن علوم و فنون کے ماخذ اُس کی آیات میں سے ڈھونڈ نکالے جائیں۔ چنانچہ زبان و بیان اور نظم کلام کی ہر دلالت کو نظر انداز کر کے کبھی فلسفۂ یونان کے اوہام اِس سے ثابت کیے گئے، کبھی ایک خاص زمانے کی سائنسی معلومات کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ وہ درحقیقت اِس کی فلاں اور فلاں

آیت سے اخذ کی گئی ہیں، کبھی علم طب اور نجوم و فلکیات کے بعض عقائد اِس سے برآمد کیے گئے، اور کبھی انسان کے ایٹم بم بنانے اور چاند پر پہنچنے کا ذکر اِس میں سے نکال کر دکھایا گیا۔

یہ ساری زحمت لوگوں کو صرف اِس لیے اٹھانا پڑی کہ اُنھوں نے اِس کتاب کے بارے میں بالکل غلط تصور قائم کر لیا۔ وہ اِس بات کو نہیں سمجھے کہ عالم کے پروردگار نے اِس کتاب سے پہلے انسان کو عقل عطا کی ہے۔ جس طرح یہ کتاب پروردگار کی عنایت ہے، اِسی طرح عقل بھی اُسی کی عنایت ہے۔ چنانچہ جن معاملات میں عقل کی رہنمائی اُس کے لیے کافی ہے، اُن سے اِس کتاب کو کوئی تعلق نہیں اور جن سے یہ کتاب بحث کرتی ہے، اُن میں عقل اگر اپنے وجود ہی سے غافل نہ ہو جائے تو اِس کی رہنمائی سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتی۔

یہ صرف قرآن مجید ہی کا معاملہ نہیں ہے، اللہ کے نبی نے اپنے بارے میں بھی یہ حقیقت اپنے ماننے والوں کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھائی ہے۔ ام المومنین سیدہ عائشہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو کھجوروں میں گابھا دیتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اِس کے بغیر ہی ٹھیک ہے۔ اُنھوں نے اُس سال گابھا نہیں دیا۔ چنانچہ پھل بہت ردی آیا۔ لوگوں نے آپ سے اِس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: تم اِس طرح کے معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہو۔ میں تمھیں اللہ کا دین بتانے آیا ہوں، اِس

لیے میری طرف صرف اُسی کے لیے رجوع کیا کرو*۔

ہم اگر قرآن مجید سے فی الواقع ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ اُس کی طرف صرف دین کے حقائق و معارف جاننے کے لیے رجوع کریں۔ اپنے سونے کے لیے چارپائی بنانے اور اپنی آواز زہرہ و مریخ تک پہنچانے کے لیے ہمیں اپنی عقل کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ اُس نے انسان کو اپنے دائرۂ عمل میں کبھی مایوس نہیں کیا۔

قرآن مجید ہم کو یہ بتانے کے لیے نازل کیا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کی رضا ہم اِس دنیا میں کن چیزوں کو مان کر اور کن چیزوں پر عمل کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں اُس کی آیات میں اپنی خواہشوں کا مضمون پڑھنے کے بجاے اپنی خواہشوں کو اُس کی پیروی کے لیے مجبور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات قرآن میں جگہ جگہ واضح کی ہے کہ اُس سے ہدایت حاصل کرنے کی پہلی شرط یہی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص دنیا کے سارے علوم و فنون اِسی ایک کتاب میں دیکھنے کی خواہش رکھتا ہو، لیکن اُس کی یہ خواہش اِس حقیقت کو نہیں بدل سکتی کہ اِس میں صرف اُس علم کا بیان ہے جو انسان کی ابدی فلاح کے لیے ضروری ہے۔

[۱۹۸۷ء]

---

* مسلم، رقم ۶۱۲۶-۶۱۲۸۔

نفاذ شریعت

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جمہوریت اسلام کے لیے ایک اجنبی تصور ہے۔ حکومت قائم کرنے کا مثالی طریقہ اسلام کی رو سے وہی ہے جو طالبان نے افغانستان میں ملا عمر کی حکومت قائم کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ آئین، پارلیمان اور انتخابات، یہ سب دور جدید کے خرافات ہیں۔ اسلام اپنے نفاذ کے لیے اِن میں سے کسی چیز کا پابند نہیں ہے۔ اُس کی جو تعبیر فقہ حنفی میں ہو چکی ہے، ہمارے لیے وہی حتمی ہے۔ فقہا کے اجتہادات بھی مدون ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق فقہا نے اپنے فیصلے مرتب کر دیے ہیں۔ یہ سب قرآن، سنت، اجماع اور قیاس کی بنیاد پر مرتب کیے گئے ہیں اور فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ اِنھیں نافذ ہونا چاہیے۔ اِس کے لیے کسی پارلیمان سے منظوری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس کا جو طریقہ یہ حضرات تجویز کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ریاست کے تمام اداروں پر عدلیہ کی بالادستی قائم ہو اور عدلیہ علما کے حوالے کر دی جائے، اِس لیے کہ اسلامی شریعت کے ماہرین وہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ گذشتہ بارہ صدیوں کی تاریخ اُن کی پشت پر ہے۔ سلطنت عباسیہ کے قاضی القضاۃ 'Chief Justice' کی حیثیت سے امام ابو یوسف کے تقرر کے بعد ہر

جگہ یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ اِسے مغربی استعمار نے ختم کیا تھا۔ مسلمان اب آزاد ہیں، لہٰذا نظم ریاست کو شریعت کے مطابق چلانے کا یہ طریقہ بھی بحال ہونا چاہیے۔

اسلام کو جو کچھ میں نے سمجھا ہے، اُس کی بنا پر پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ قرآن اِس نقطۂ نظر کو قبول نہیں کرتا۔ نظم ریاست کو چلانے کا جو طریقہ اُس نے بتایا ہے، وہ جمہوریت ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے: 'اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ'، ''مسلمانوں کے معاملات اُن کے باہمی مشورے سے چلائے جاتے ہیں۔'' سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اِسی کی وضاحت میں فرمایا ہے: ''جس نے مسلمانوں کی رائے کے بغیر کسی کی بیعت کی، وہ اپنے آپ کو قتل کے لیے پیش کرے گا۔'' ہماری تاریخ میں اِس مقصد سے بادشاہت کا طریقہ بھی اختیار کیا گیا ہے اور آمریت کا بھی اور ہمارے بعض گروہ اِس بات کے بھی قائل رہے ہیں کہ حکومت کے سربراہ کو خدا کا مامور ہونا چاہیے، لیکن نظم ریاست کو چلانے کے لیے قرآن کا مقرر کردہ قاعدہ یہی ہے۔ اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے یہ قاعدہ جن چیزوں کا تقاضا کرتا ہے، دور حاضر کے ایک جلیل القدر عالم مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی تفسیر میں بیان فرمائی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اول یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں، اُنھیں اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو اور وہ اِس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ اُن کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں اور اُنھیں اِس امر کا بھی پورا حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی

غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اُس پر ٹوک سکیں، احتجاج کر سکیں اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کر کے اور اُن کے ہاتھ پاؤں کس کر اور اُن کو بے خبر رکھ کر اُن کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے، جسے کوئی شخص بھی 'اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ' کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو، اُسے لوگوں کی رضامندی سے مقرر کیا جائے اور یہ رضامندی اُن کی آزادانہ رضامندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی یا تحریص واطماع سے خریدی ہوئی یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضامندی، درحقیقت رضامندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا جو ہر ممکن طریقے سے کوشش کر کے اُس کا سربراہ بنے، بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جا سکتے جو دباؤ ڈال کر یا مال سے خرید کر یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر یا لوگوں کو گمراہ کر کے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان وضمیر کے مطابق رائے دیں اور اِس طرح کے اظہار رائے کی اُنھیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو، جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر یا کسی جتھا بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں، وہاں درحقیقت

خیانت اور غداری ہوگی، نہ کہ 'اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ' کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو، اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ: ''اُن کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے'' بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ: ''اُن کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔'' اِس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی، بلکہ اِس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو، اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔'' (تفہیم القرآن ۴/۵۰۹)

اِس سے واضح ہے کہ ریاست سے متعلق دین نے بھی کوئی حکم اگر دیا ہے تو اُس کی تعبیر و تشریح کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا۔ دینی علوم کے ماہرین اپنی اپنی تشریحات پیش کر سکتے ہیں۔ اُن کا حق ہے کہ اپنے موقف کا اظہار کریں، مگر اُن کے اِس موقف کو لوگوں کے لیے واجب الاطاعت قانون کی حیثیت اُسی وقت حاصل ہو گی، جب اُن کے منتخب نمائندوں کی اکثریت اُسے قبول کر لے گی۔ جدید ریاست میں پارلیمان کا ادارہ اِسی مقصد سے قائم کیا جاتا ہے۔ ریاست کے نظام میں آخری فیصلہ اُسی کا ہے اور اُسی کا ہونا چاہیے۔ لوگوں کا حق ہے کہ پارلیمان کے فیصلوں پر تنقید کریں اور اُن کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرتے رہیں، لیکن اُن کی خلاف ورزی اور اُن سے بغاوت کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ علما ہوں یا ریاست کی عدلیہ،

پارلیمان سے کوئی بالاتر نہیں ہوسکتا۔ ہر ادارہ پابند ہے کہ اُس کے فیصلوں سے اختلاف کے باوجود عملاً اُن کے سامنے سرِتسلیم خم کردے۔

پارلیمان کی یہ حیثیت تسلیم کرلی جائے تو ''اسلامی ریاست'' اور ''سیکولر ریاست'' کی تعبیرات بھی غیر متعلق ہو جاتی ہیں۔ اِس طرح کی چیزیں شخصی حکومتوں کے لیے ضروری تھیں۔ ہماری جدوجہد کا محور ایک خالص جمہوری ریاست ہونا چاہیے۔ یہ ریاست اگر ایک مرتبہ قائم ہو جائے تو لوگ جتنے مسلمان ہوں گے، اسلام اُسی کے بقدر اُن کی ریاست کے نظام میں ظہور پذیر ہو جائے گا۔ اِس کا فطری طریقہ یہی ہے۔ اِس سے ہٹ کر جو کچھ کیا جائے گا، اُس کا نتیجہ منافقت ہوگی جس کا تجربہ ہم گذشتہ نصف صدی سے پاکستان میں کر رہے ہیں۔

علما اور مصلحین کا اصلی کام یہ ہے کہ تعلیم و تعلم کے ذریعے سے وہ عوام و خواص کے اذہان اِس کے لیے تیار کریں۔ اُنھیں حکمت کے ساتھ اور موعظۂ حسنہ کے اسلوب میں اِس کی دعوت دیں، اُن کے سوالات کا سامنا کریں، اُن کے اشکالات دور کریں اور دلائل کے ساتھ اُنھیں بتائیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کیوں دی ہے؟ اجتماعی زندگی کے ساتھ اُس کا کیا تعلق ہے؟ اُس میں احکام کی بنیاد کیا ہے اور دورِ حاضر کا انسان اُس کو سمجھنے میں دقت کیوں محسوس کرتا ہے؟ اُس کی تفہیم و تبیین کے لیے ایسے اسالیب اختیار کریں جن سے اُس کی حکمت، معنویت اور اُس کے مقاصد لوگوں پر واضح ہوں اور اُن کے دل و دماغ پورے اطمینان کے ساتھ اُسے قبول کرنے کے لیے

تیار ہو جائیں۔ قرآن میں اُن کا منصب دعوت وانذار قرار دیا گیا ہے، وہ اپنی قوم کے لیے داروغہ نہیں بنائے گئے کہ اپنے پیروکاروں کے جتھے منظّم کر کے بندوق کے زور پر اُسے شریعت کا پابند بنانے کی کوشش کریں۔ علما تو ایک طرف، ریاست کا نظم اجتماعی بھی نماز اور زکوٰۃ کے سوا دین کے ایجابی تقاضوں میں سے کوئی چیز لوگوں پر قانون کی طاقت سے نافذ نہیں کر سکتا۔ قرآن اِس معاملے میں بالکل واضح ہے کہ آخرت میں جواب دہی کے لحاظ سے اسلام کے مطالبات اپنے ماننے والوں سے خواہ کچھ ہوں، اُن کی ریاست جو مطالبات اُن سے کر سکتی ہے، وہ یہی ہیں۔ اِن کے علاوہ یہ صرف تبلیغ وتلقین اور تعلیم وتدریس ہے جس کے ذریعے سے اُن کی اصلاح کی جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ علما اگر سیاست سے دل چسپی رکھتے ہوں تو سیاسی جماعتیں موجود ہیں، وہ اُن میں شامل ہو کر پارلیمان میں پہنچ سکتے اور قانون سازی کے لیے مقرر کردہ طریقوں کے مطابق قانون کی اسلامی تشکیل کے لیے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

دینی ولادینی

یہ سولھویں صدی کا وسط تھا، جب مغرب میں وہ جنگ شروع ہوئی جس نے بالآخر پوپ کی مقدس پادشاہی کا خاتمہ کر دیا۔ اِس پادشاہی میں وہ خدا کا نائب تھا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ زمین پر وہ جو کچھ جوڑ دیتا ہے، وہ آسمان پر بھی باقی رہتا ہے۔ اُس پر وہ زمانہ بھی

گزر چکا تھا، جب شہنشاہ روما ہنری چہارم تین دن اور تین راتیں برہنہ سر اور برہنہ پا اطالیہ کے اُس قلعے کے دروازے پر پڑا عاجزی کرتا اور معافی مانگتا رہا جس میں پاپائے اعظم مقیم تھا، لیکن اُس نے دروازہ نہیں کھولا۔ پندرھویں صدی کے آخر اور سولھویں صدی کی ابتدا میں مارٹن لوتھر نے اُس کے اقتدار کو چیلنج کیا، ایراسمس (Erasmus)، کال ون (Calvin)، اور زونگلی (Zwingly) نے یورپ کے دوسرے علاقوں میں اِس تحریک کو آگے بڑھایا۔ اِس کے نتیجے میں ایک عظیم جنگ برپا ہوئی۔ عوام نے اِس جنگ میں مصلحین کا ساتھ دیا۔ چنانچہ پوپ نے ہزیمت اٹھائی اور اُس کا اقتدار ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

مغرب میں علوم کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کی تحریک اِسی فتح کے نتیجے میں عروج کو پہنچی۔ اِس تحریک کے فتوحات بے مثال ہیں؛ اِس نے فطرت کے بے شمار حقائق بے نقاب کیے ہیں؛ انسان کے لیے بے حد و حساب سہولتیں پیدا کی ہیں؛ اُس کی حکومت بحر و بر پر قائم کر دی ہے؛ اُسے ثریا کی خبر لانے اور ثریٰ میں اترنے کے قابل بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی غیر معمولی کامیابیوں پر خود انسان حیران ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ عالم طبیعیات حیرت انگیز حد تک اُس کی گرفت میں ہے اور اُس کے خواب حقیقت میں بدل گئے ہیں۔

پوپ کے خلاف یہ جنگ اور نشاۃ ثانیہ کی یہ تحریک، دونوں انسان کا مایۂ افتخار ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ پوپ کا دعویٰ باطل تھا۔ دین حق میں کبھی کوئی پوپ اور کوئی

پادری خدا اور اُس کے بندوں کے درمیان حائل نہیں رہا۔ یہ دعویٰ ہر حال میں باطل قرار پانا چاہیے تھا۔ جن لوگوں نے اِسے باطل قرار دیا، اُنھوں نے بے شک ایک حق کا اثبات کیا۔ یہی معاملہ نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا ہے۔ علم انسان کی سب سے بڑی متاع ہے۔ اُس کی بازیافت اور دریافت کے لیے جو سعی بھی کی جائے گی، اُسے یقیناً قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ لیکن انسان کی بدقسمتی ہے کہ اِس جنگ اور اِس تحریک میں ردعمل کی نفسیات نے صرف پوپ کو رد نہیں کیا، اِس کے ساتھ کائنات کی اِس سب سے بڑی حقیقت کو بھی رد کر دیا ہے کہ انسان اِس زمین پر خدا کی مخلوق اور اپنے تمام معاملات میں اُس کے حکم کا تابع اور اُس کے سامنے جواب دہ ہے۔

یہ حقیقت کسی دلیل کی بنا پر رد نہیں ہوئی۔ چار صدیاں گزر چکی ہیں۔ اِس موضوع پر مغرب میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس کا دقت نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اِسے اندھے تعصب اور بے لگام جذبۂ نفرت نے رد کیا ہے۔ قلم نے اِس باب میں جو کچھ لکھا اور زبان نے جو کچھ کہا ہے، وہ انسان کے لیے باعث شرم ہے۔ علم و استدلال کے دور میں جہالت روا رکھی گئی۔ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہنے والوں نے حقیقت سے روگردانی کی۔ علم کی پرستش کرنے والوں نے علم کو رد کر دیا۔ یہ اِس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اِس پر اگر زمین روئے اور آسمان ماتم کرے تو کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیے۔

[۱۹۸۷ء]

مسئلۂ قومیت

رنگ، نسل، زبان، تہذیبی روایات اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم ہونے کا احساس انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، لیکن اپنے رشتہ داروں سے جو قربت محسوس ہوتی ہے، وہ دوسرے انسانوں سے محسوس نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ قوم کا ہے۔ انسان جس طرح اپنی شخصیت، خاندان اور اعزہ و اقربا کے حوالے سے اپنی انفرادیت کا اظہار کرتا اور دوسروں سے آگے رہنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے، اِسی طرح قوم کے حوالے سے بھی محسوس کرتا ہے۔ اپنی شناخت کا یہی احساس ہے جس سے لوگ مل کر مشترک معاشرت بناتے اور زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہیں۔ قرآن نے اِسے تعارف کے لفظ سے تعبیر کیا اور فرمایا ہے کہ شعوب و قبائل اِسی کے پیش نظر وجود میں آئے ہیں۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اُس کے نزدیک جو چیز قابل اعتراض ہے، وہ قومیت کی بنیاد پر تکبر ہے، دوسری قوموں سے نفرت ہے، اُنھیں کم تر سمجھ کر مغلوب کرنے، اُن کے حقوق غصب کرنے، اُن کے اور اپنے درمیان اونچ نیچ اور شریف اور کمین کے امتیازات قائم کرنے، اُنھیں ذلیل و حقیر سمجھنے اور اُن کا استحصال کرنے کے داعیات

ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِن میں سے ہر چیز کو وہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور انسانیت کے خلاف بدترین جرم قرار دیتا ہے، لیکن قومیت کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اُس کی اُن تمام بنیادوں کو تسلیم کرتا ہے جو علم سیاست میں بالعموم اُس کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ قوموں کے مابین مسابقت کے جذبے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اُس کے شایستہ اظہار پر بھی اُسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مسلمانوں کے مختلف گروہ اگر اپنی قوم کے حوالے سے اپنا تعارف کرائیں، حقوق کا مطالبہ کریں یا اپنی کوئی الگ قومی ریاست قائم کرنا چاہیں تو اِسے بھی وہ ناجائز نہیں کہتا۔ لہٰذا یہ نقطۂ نظر کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد بھی اسلام ہی ہے، کسی طرح درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن نے کسی جگہ یہ نہیں کہا کہ مسلمان ایک قوم ہیں یا اُنھیں ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر اقوام و ملل کا وجود وہ تسلیم کرتا ہے۔ اُس نے جو بات کہی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں: ’اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ‘۔ قرآن کی رو سے مسلمانوں کا باہمی رشتہ قومیت کا نہیں، بلکہ اخوت کا ہے۔ وہ دسیوں ریاستوں اور بیسیوں ممالک میں تقسیم ہونے کے باوجود ایمان کے رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اِس لیے یہ تقاضا تو اُن سے کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے کہ اپنے بھائیوں کے حالات کی خبر رکھیں، اُن کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں اُن کے کام آئیں، وہ مظلوم ہوں تو اُن کی مدد کریں، معاشی اور معاشرتی روابط کے لیے اُنھیں ترجیح دیں اور اُن پر اپنے دروازے کسی حال میں بند نہ کریں، مگر یہ تقاضا نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی قومی ریاستوں اور قومی

شناخت سے دستبردار ہو کر لازماً ایک ہی قوم اور ایک ہی ریاست بن جائیں۔ وہ جس طرح اپنی الگ الگ قومی ریاستیں قائم کر سکتے ہیں، اِسی طرح دین و شریعت پر عمل کی آزادی ہو تو غیر مسلم اکثریت کی ریاستوں میں شہری کی حیثیت سے اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن کر رہ بھی سکتے ہیں۔ اِن میں سے کوئی چیز قرآن و سنت کی رو سے ناجائز نہیں ہے۔

[۲۰۰۸ء]

ہماری تعلیم

[۱]

اِس ملک کا تعلیمی نظام دو بڑے حصوں میں بٹا ہوا ہے: ایک دینی مدارس، دوسرے دنیوی تعلیم کی درس گاہیں۔ پہلے دینی مدارس کو لیجیے۔ اِن کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ تقلید کے اصول پر قائم ہوئے ہیں۔ اِن میں یہ بات پہلے دن سے طے کر دی جاتی ہے کہ حنفی ہمیشہ حنفی رہے گا اور اہل حدیث کو ہر حال میں اہل حدیث ہی رہنا ہے۔ اپنے دائرے سے باہر کے اہل علم کی کسی تحقیق اور رائے کے بارے میں یہ تصور بھی اِن کے ہاں ممنوعات میں سے ہے کہ وہ صحیح ہو سکتی ہے۔ مذہب ابوحنیفہ کا کوئی پیرو ائمۂ محدثین کے کسی مسلک کو، اور ائمۂ محدثین کے طریقے پر عمل کرنے والا کوئی

شخص مذہب ابوحنیفہ کے کسی نقطۂ نظر کو کبھی ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ہر جماعت مصر ہے کہ اُس کا مذہب ہر اعتبار سے اوفق بالقرآن والسنہ ہے اور اُس پر اب کسی نظر ثانی کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی شخص اِن مدارس میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اُس کے اکابر کی کوئی رائے اور تحقیق بھی کسی مسئلے کے بارے میں غلط ہو سکتی ہے۔

اِس اصول پر اِن مدارس سے پڑھ کر نکلنے والوں کی ''استقامت'' سے جو بگاڑ ہمارے معاشرے میں پیدا ہوا ہے، وہ کسی صاحب نظر سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ ہم صبح و شام دیکھتے ہیں کہ فرقہ بندی کا ناسور اِس ملت کے جسم میں جاری اور اختلاف ہمیشہ اتفاق پر بھاری رہتا ہے۔ منبر ہمہ وقت غضب سے کانپتا اور محراب ہمیشہ ترش ابرو ہوتی ہے۔ مسجدوں کے حدود ملکوں کی سرحدیں بن گئے ہیں اور اُن میں رہنے والے ایک دوسرے سے کوئی تعلق قائم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ فقہی تعصّبات دین کی عصبیت پر غالب آ گئے ہیں اور یہ لوگ اُن کی حفاظت کے لیے اب بغیر کسی تردد کے ہر باطل کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ فقہ اسلامی کی تدوین اور اِس ملک میں اُس کے نفاذ کی ہر کوشش بالعموم اِنھی تعصّبات کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ اِس طرح کے مواقع پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ محض مکاتب فکر نہیں، اقوام و ملل ہیں جو اپنے اپنے مفادات کی حمایت میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو گئی ہیں۔ یہ بگاڑ اِس زمانے میں جب نفاذ دین کی باتیں کچھ زیادہ ہونے لگی ہیں، بہت نمایاں ہو گیا ہے۔

اِن میں سے جو کچھ وسعت نظر کے مدعی ہیں، اُن کا حال بھی یہ ہے کہ اگر شخص واحد کی تقلید پر اصرار نہیں کرتے تو اِس بات پر، بہر حال مصر ہیں کہ قرآن وسنت پر براہ راست غور وتدبر کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے بعد بند ہو چکا ہے۔ اُن کے نزدیک اب قیامت تک کسی شخص کو اِسے کھولنے کی جسارت نہیں کرنی چاہیے۔ علم اُن کی رائے میں جمع اقوال کا نام ہے اور تحقیق یہ اِسے ہی کہتے ہیں کہ کسی مدعا کو ثابت کرنے کے لیے اگلوں میں سے دس بیس کی آرا بطور حوالہ نقل کر دی جائیں۔ کسی آیت کی تاویل اور کسی حدیث کی شرح میں کوئی نئی تحقیق، اگر کوئی شخص پیش کر دے تو اُسے مردود قرار دینے میں یہ لمحے بھر کا توقف بھی گوارا نہیں کرتے۔ بڑی سے بڑی غلطی پر بھی یہ محض اِس وجہ سے مصر ہو جاتے ہیں کہ پہلوں میں سے کسی کو اِس سے اختلاف نہیں رہا۔ یہ چیز اِن کے ہاں کوئی معمولی اہمیت نہیں رکھتی، یہ اِسے ایمان وعقیدہ کے طور پر اختیار کیے ہوئے ہیں۔

اپنے اِس نقطۂ نظر کے جو دلائل یہ حضرات بالعموم پیش فرماتے ہیں، وہ عقل ونقل، دونوں کی رو سے بالکل بے بنیاد ہیں۔ اِن میں سے ہر شخص اِس حقیقت سے واقف ہے کہ اِس دین کا سب سے پہلا ماخذ قرآن مجید ہے۔ قرآن کے بارے میں یہ بات محتاج بیان نہیں کہ یہ جس طرح اگلوں کے پاس تھا، بالکل اُسی صورت میں ہمارے پاس بھی موجود ہے۔ اُس کے کسی حرف اور کسی شوشے میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اُس کی زبان عربی مبین ہے۔ اُس کے الفاظ واسالیب کے معنی کی تحقیق کے لیے تمام

ضروری مواد اِس زمانے میں بھی اُسی طرح میسر ہے، جس طرح اِس امت کے پہلے دور میں تھا۔ قرآن مجید کے بعد دوسرا ماخذ حدیث وسنت ہے۔ اِس کا بیش تر حصہ تواتر عملی کے ذریعے سے ہمیں ملا ہے۔ باقی جو کچھ اخبار آحاد کی صورت میں تھا، اُس میں جتنا کچھ ہمارے اسلاف نے قابل اعتماد پایا، وہ سب اُنھوں نے ہمیں منتقل کر دیا ہے۔ اُس میں سے کوئی چیز بھی اُنھوں نے چھپا کر نہیں رکھی۔ جو کچھ اُنھوں نے چھوڑا اور جو کچھ اختیار کیا ہے، اِس کے وجوہ بھی اُنھوں نے بیان کر دیے ہیں۔ دین میں یہی دو چیزیں اصل حجت ہیں اور یہ دونوں اِس زمانے میں اُسی طرح ہمارے پاس موجود ہیں، جس طرح اگلوں کے پاس تھیں۔

چنانچہ اِس بنیاد پر کوئی محکم دلیل اِس نقطۂ نظر کے حق میں قائم نہیں کی جا سکتی۔

اِس کے بعد دو باتیں کہی جا سکتی ہیں: ایک یہ کہ دین پر عمل کے لحاظ سے جو مقام اگلوں کو حاصل تھا، وہ اِس زمانے کے لوگوں کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ دوسری یہ کہ فہم و ذکا کے اعتبار سے جو درجہ اُن کا تھا، اُس تک اب کسی کے لیے پہنچنا ممکن نہیں رہا۔

اِن میں سے آخری بات محض ادعا ہوگی جس کے لیے کوئی ثبوت نہ قرآن وحدیث میں موجود ہے، نہ علم و تجربہ سے اِس کی تصدیق ہوتی ہے۔ رہی پہلی بات تو وہ قرآن مجید کی نص کے خلاف ہے۔ قرآن نے بالصراحت فرمایا ہے کہ عملی لحاظ سے دین میں سب سے اونچا درجہ 'السابقون' کا ہے اور یہ جس طرح اگلوں میں تھے، اِس طرح پچھلوں میں بھی ہوں گے۔ سورۂ واقعہ میں ہے:

وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ، اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ، فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ، ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ، وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ. (۵۶:۱۰-۱۴)	''اور سبقت کرنے والے تو پھر سبقت کرنے والے ہی ہیں۔ وہی تو مقرب ہوں گے، نعمت کے باغوں میں۔ اگلوں میں سے زیادہ اور پچھلوں میں سے کم۔''

اِس کے علاوہ اِس نقطۂ نظر کے موید ین جو کچھ کہتے ہیں، وہ محض جذبات کی شاعری ہے۔ علم واستدلال کی دنیا میں اِس کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔

دوسری بڑی خرابی اِن مدارس کے نظام میں یہ ہے کہ یہ اگرچہ دینی مدارس ہیں، لیکن دین میں جو حیثیت قرآن مجید کو حاصل ہے، وہ اِن میں اِسے کبھی حاصل نہیں ہو سکی۔ دین میں وہ اِس زمین پر اللہ کی اتاری ہوئی میزان اور حق و باطل کے لیے فرقان ہے۔ اُس کی اِس حیثیت کا ناگزیر تقاضا تھا کہ اِن مدارس کے نصاب میں محور و مرکز کا مقام اُسے ہی حاصل ہوتا۔ تدریس کی ابتدا اُس سے کی جاتی اور اُس کی انتہا بھی وہی قرار پاتا۔ علم وفن کی ہر وادی میں طلبہ اُسے ہاتھ میں لے کر نکلتے اور ہر منزل اُس کی رہنمائی میں طے کی جاتی۔ جو کچھ پڑھایا جاتا، اُسی کو سمجھنے اور اُسی کے مدعا کو پانے کے لیے پڑھایا جاتا۔ نحو وادب، فلسفہ وکلام اور فقہ وحدیث کے لیے اُسے معیار مانا جاتا اور ہر چیز کے ردوقبول کا فیصلہ اُس کی آیات بینات کی روشنی میں ہوتا۔ ایمان وعقیدہ کی ہر بحث اُس سے شروع ہوتی اور اُسی پر ختم کر دی جاتی۔ طلبہ اُس کے ہر لفظ پر مراقبہ

کرتے اور اُس کی ہر آیت پر ڈیرے ڈالتے۔ اُنھیں بتایا جاتا کہ بوحنیفہ و شافعی، بخاری و مسلم، اشعری و ماتریدی اور جنید و شبلی، سب پر اُس کی حکومت قائم ہے اور اُس کے خلاف اِن میں سے کسی کی کوئی چیز بھی قبول نہیں کی جا سکتی۔

دین میں قرآن مجید کی حیثیت یہی ہے اور یہی حیثیت اُسے اِن مدارس کے نظام میں حاصل ہونی چاہیے تھی، لیکن ہر صاحب علم اِس حقیقت سے واقف ہے کہ پہلے مرحلے میں اِن مدارس کے طلبہ محض حفظ و قراءت کے لیے اُس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور آخری مرحلے میں جلالین و بیضاوی کے صفحات میں اُس کی کچھ زیارت کر لیتے ہیں، اِس سے زیادہ کوئی مقام اِن مدارس میں اُسے کبھی نہیں دیا گیا۔

قرآن مجید کے معاملے میں اِس رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ فکر و عمل کے لیے کوئی چیز اب حَکَم نہیں رہی اور علم اختلافات کی بھول بھلیاں میں سرگرداں ہے۔ وہ منابع جہاں سے ہمیں روشنی مل سکتی تھی، خود تیرہ و تار ہیں اور ہمارے مدرس و ملا اور اِس کتاب منیر میں بالعموم وہی تعلق قائم ہے جس کے بارے میں اقبال نے اپنا لف و نشر ترتیب دیا تھا کہ:

مکتب و ملا و اسرار کتاب
کور مادر زاد و نور آفتاب

اِن مدارس کے نظام میں تیسری بڑی خرابی یہ ہے کہ اِن کا نصاب نہایت فرسودہ اور ہماری علمی اور دینی ضرورتوں کے لیے بالکل بے حاصل ہے۔ یہ نصاب، جیسا کہ عام

خیال ہے، ملانظام الدین نے ترتیب دیا یا پھلواری شریف کے سجادہ نشین شاہ سلیمان کی رائے کے مطابق اِس کا بیج ابتدا میں ملا فتح اللہ شیرازی نے بکھیرا اور یہ خودرو پودوں کی طرح آپ سے آپ اِس صورت میں نمودار ہوگیا، بہرحال ہمارے اُس دور کی پیداوار ہے، جب علم کے اصل ماخذوں سے ہم بے تعلق ہو چکے تھے۔ قرآن مجید کو جو مقام اِس نصاب میں دیا گیا ہے، وہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ حدیث اگرچہ شامل نصاب ہے، لیکن اِس کے لیے دورہ کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اُس سے تدبر حدیث کا کوئی ذوق پڑھنے اور پڑھانے والوں میں کبھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ جاہلی ادب کی اہمیت اِس نصاب میں کبھی مانی نہیں گئی۔ چنانچہ قرآن مجید کی زبان اور اُس کے اسالیب کی ندرتوں سے اِس کے طلبہ کم ہی کبھی واقف ہوئے ہیں۔ نحو و بلاغت کی جو کتابیں اِس میں شامل ہیں، اُن میں چونکہ منطق زیادہ اور نطق کی رعایت بہت کم ملحوظ رکھی گئی ہے، اِس وجہ سے اِن فنون کے اعلیٰ مباحث کو سمجھنے کا ذوق اگر طالب علم میں ہو بھی تو اِن کتابوں کے پڑھنے کے بعد باقی نہیں رہتا۔ منطق و فلسفہ اور علم کلام کے لیے جو کچھ اِس نصاب میں رکھا گیا ہے، اُس کا ضرر اُس کی منفعت سے زیادہ ہے۔ فقہ احناف ہی کی پڑھائی جاتی ہے، فقہ اسلامی کی تدریس کا کوئی تصور اِس کے بنانے والوں کے ذہن میں کبھی نہیں رہا۔ اصول کا فن ہم مسلمانوں کے لیے مایۂ افتخار ہے، لیکن اِس کے لیے بھی کوئی ایسی کتاب اِس میں شامل نہیں کی گئی جو اجتہادی بصیرت پیدا کرنے والی ہو۔ دو صدیاں اِس نصاب پر گزر گئیں، لیکن دنیوی علوم میں بھی یہ کسی ترقی کو قبول کرنے کے لیے کبھی

تیار نہیں ہوا۔ فلسفہ، نفسیات، علم الاقتصاد، علم الافلاک، طبیعیات، علم السیاسہ اور اِس طرح کے دوسرے فنون میں جو تحقیقات اِس دوران میں ہوئی ہیں، وہ ابھی تک اِس میں بار نہیں پا سکیں۔ اِسے حسن عقیدت ہی کا کرشمہ سمجھنا چاہیے کہ صدرا و میبذیؒ کو بھی اِس میں حیات ابدی حاصل ہو گئی ہے۔ ہمارے بزرگ اِسے اِس قدر مقدس سمجھتے ہیں کہ اِس کی اِن کتابوں میں بھی کوئی تبدیلی اُن کے نزدیک جائز نہیں ہے۔ نئے علوم دنیا پر حکومت کر رہے ہیں، لیکن اِس نصاب کے پڑھنے والے ابھی تک اُن کے وجود پر بھی مطلع نہیں ہوئے۔ دنیا نے اِن دو صدیوں میں بہت کچھ مانا اور ماننے کے بعد پھر انکار کر دیا، لیکن یہ نہ اِس ماننے سے واقف ہوئے اور نہ اِس انکار کی کوئی خبر اُنھیں ابھی تک پہنچی ہے۔

[۲]

اِس کے بعد اب عام دنیوی تعلیم کی درس گاہوں کو لیجیے۔ یہ جس نظام پر قائم ہیں، اُس کی تعمیر میں ابتدا ہی سے خرابی کی بہت سی صورتیں مضمر رہی ہیں۔ اِس کی بنیاد برصغیر کے برطانوی حکمرانوں نے رکھی تھی۔ اُنھیں یہاں سے گئے ہوئے اب پینتالیس سال ہونے کو ہیں، لیکن ہم اِس کی اصلاح تو کیا کرتے، حقیقت یہ ہے کہ اِس ملک میں ہر نئی

۱؎ درس نظامی میں فلسفہ کی دو کتابیں۔ یہ دراصل اِس مضمون میں اثیر الدین ابہری کی کتاب ''ہدایۃ الحکمہ'' کی دو شرحیں ہیں جو اپنے لکھنے والوں ہی کے نام سے مشہور ہوئیں۔ اِن میں اول الذکر ملا صدر الدین شیرازی اور موخر الذکر معین الدین میبذی کی تصنیف ہے۔

صبح غلامی کی اِس میراث کے ساتھ ہماری محبت میں اضافے کا پیغام لے کر طلوع ہوئی ہے۔ چنانچہ یہ نظام اُن ساری خرابیوں کے ساتھ جو اُس کی پیدایش کے وقت سے اِسے لاحق ہیں، ابھی تک ہم پر مسلط ہے۔

اِس نظام کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک لادینی نظام ہے۔ اِس کی بنا اِس اصول پر رکھی گئی ہے کہ عالم کا عقدہ کسی مابعد الطبیعیاتی اساس کے بغیر بھی کھل سکتا اور انسان کا مسئلہ خود اُس کے بنانے والے کی رہنمائی کے بغیر بھی حل ہو سکتا ہے۔ یہی اصول ہے جس پر مغرب میں فلسفہ، سائنس، عمرانیات اور دوسرے علوم و فنون کا ارتقا اِن پچھلی دو صدیوں میں ہوا ہے اور جسے ابھی تک مغربی فکر میں اصل اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ اِس میں شبہ نہیں کہ مغرب میں سب اہل فکر خدا کے منکر نہیں ہو گئے، لیکن اِس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اُن کی فکر کا بنیادی مقدمہ اِس انکار ہی پر استوار ہوا ہے۔ چنانچہ اِن علوم کی تدریس کے لیے جو نصاب اِن درس گاہوں میں رائج ہے، اُس میں یہ کارخانۂ عالم بغیر کسی خالق کے وجود میں آتا اور بغیر کسی مدبر ہی کے چلتا نظر آتا ہے۔ انسان اِس میں آپ ہی اپنی تقدیر بناتا اور آپ ہی اُسے بگاڑتا ہے۔ قانون و سیاست اور معیشت و معاشرت کے سارے اصول اِس میں 'بغیر ھدی و لا کتاب منیر' وجود میں آتے اور دنیا اِنھی کی روشنی میں اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ انسان کی تاریخ اِس میں انسان سے شروع ہوتی اور انسان ہی پر ختم ہو جاتی ہے۔ ذات خداوندی کے لیے اِس میں نہ ابتدا میں کوئی جگہ

ہے، نہ انتہا میں۔ اِس سلسلۂ روز و شب کے بارے میں یہ بات اِس نصاب کی روح میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ وہی درحقیقت ابتدا، وہی انتہا اور وہی باطن و ظاہر ہے۔ چنانچہ اِس کی تعلیم پانے والے بغیر کسی ترغیب و دعوت کے آپ سے آپ اِس نقطۂ نظر کے حامل بن جاتے ہیں کہ زندگی خدا سے بے تعلق ہو کر بھی بسر کی جا سکتی ہے اور دنیا کا نظام اُس کی رہنمائی سے بے نیاز ہو کر بھی چلایا جا سکتا ہے۔ دینیات کی تعلیم، بے شک اِس میں لازم کر دی گئی ہے، لیکن کسی بنیادی تبدیلی کے بغیر اِس عنایت کا نتیجہ اِس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ یہ نصاب سراپا تضاد اور اِس کے پڑھنے والوں کے دماغ دینی ولادینی کی رزم گاہ بن گئے ہیں۔ ببول کے درختوں پر انگور کی بیل چڑھانے اور حکایت بادہ و جام سنانے کے بعد زم زم کے فضائل بیان کرنے سے جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے، وہی اِس نصاب میں دینیات کا پیوند لگانے سے حاصل ہوا ہے۔ اِس کی سب سے نمایاں مثال وہ لوگ ہیں جنھیں عام اصطلاح میں دانش ور کہا جاتا ہے۔ اُن کی زبان اور اُن کا قلم گواہی دیتا ہے کہ حق تو درحقیقت وہی ہے جسے ائمۂ مغرب حق قرار دیں، لیکن قرآن کی تعبیر بھی اگر اِس 'حق' کے مطابق کر دی جائے تو اُسے ایک مقدس مذہبی کتاب کی حیثیت سے قابل احترام قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن کا وجود ایک مجموعۂ تضادات ہے۔ خدا کا وہ انکار نہیں کرتے، لیکن اُس کی عبادت کے لیے روزہ و نماز کی پابندی پر اصرار بھی اُن کی سمجھ میں نہیں آتا۔ آخرت کے وہ منکر نہیں ہیں، لیکن اُس کے لیے دنیا کی کچھ لذتوں کو چھوڑنے کے لیے بھی اُن کا دل آمادہ نہیں ہوتا۔ رسالت کو وہ مانتے ہیں، لیکن رسول کے

احکام بھی اُنھیں اِس دور میں قابل عمل نظر نہیں آتے۔ قرآن کی تلاوت سے وہ اپنی مجلسوں کی ابتدا کرتے ہیں، لیکن پادشاہ ارض وسما کے فرمان واجب الاذعان کی حیثیت سے اپنے دستور و قانون پر اُسے بالاتر قرار دینا بھی اُنھیں گراں گزرتا ہے۔ اُن کی ہستی ایک آئینہ ہے جس میں ہم اِس پیوند کاری کے نتائج بچشم سر دیکھ سکتے اور اُن سے عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ اِس نظام تعلیم نے اُن کا گلا گھونٹ دیا اور روح دین اُن کے بدن سے نکال دی ہے۔ یہ بظاہر زندہ نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت یہی ہے کہ:

مردہ ہیں، مانگ کے لائے ہیں فرنگی سے نفس

اِس نظام کی اِس لادینی فطرت نے صرف یہ ذہنی ارتداد ہی ہماری قوم کے کارفرما عناصر میں پیدا نہیں کیا، اِس کے ساتھ اُنھیں اُس سیرت و کردار سے بھی محروم کر دیا ہے جس کے بغیر کوئی قوم دنیا میں زندہ نہیں رہ سکتی۔ اِس میں یہ بات کبھی پیش نظر نہیں رہی کہ تعلیمی ادارے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لیے قائم نہیں کیے جاتے، اُن کا ایک بڑا مقصد کسی قوم کے بنیادی نظریے کے مطابق اُس کی آیندہ نسلوں کی تربیت اخلاق اور تہذیب نفس بھی ہے۔ یہ مقصد، اُسی صورت میں حاصل ہوسکتا تھا کہ دوسری تدبیروں کے ساتھ بالخصوص اساتذہ کے انتخاب میں یہ بات ہر حال میں ملحوظ رکھی جاتی کہ وہ صرف اپنے مضمون ہی کے ماہر نہ ہوں، اِس کے ساتھ دین کے معاملے میں بالکل یک سو، اُس کے احکام کے پیرو اور اُس نے جن اخلاق عالیہ کی تعلیم دی ہے، اُس کا بہترین نمونہ بھی ہوں۔ کسی قوم کی تہذیب اور اُس کی اخلاقی تربیت کا کوئی طریقہ اِس

سے زیادہ موثر نہیں ہوسکتا۔ ماں کی آغوش کے بعد اِس معاملے میں اہم ترین عامل استاد کی شخصیت ہی ہوتی ہے۔ وہ اگر کسی نظریے کو پوری سچائی کے ساتھ مانتا اور پوری دیانت داری کے ساتھ اُس کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتا ہو تو اُس کے طلبہ یقیناً اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہمارے اِس نظامِ تعلیم میں اِس چیز کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ چنانچہ یہ اِسی کا نتیجہ ہے کہ عزیمت و استقامت، حوصلہ و مروت، نظم و ضبط اور صبر و ثبات جیسی اعلیٰ صفات اِس قوم کے نوجوانوں میں اب ہم ڈھونڈے نہیں پاتے۔ امانت، دیانت، فرض شناسی، وفاشعاری اور ایثار و قربانی قصۂ ماضی ہیں۔ نظر کی عفت، طبیعت کا حسن، خیال کی بلندی، ضمیر کی پاکیزگی اور ذوق کی لطافت اب کم ہی کہیں نظر آتی ہے۔ بددیانت، بدکار، رشوت خور، خویش پرور اور ادنیٰ خواہشوں کے غلام نوجوان ہی اب ہماری پہچان ہیں۔ ہماری یہ نئی نسل اپنی قوم کے ماضی سے بےگانہ، حال سے بےپروا اور مستقبل سے بےتعلق ہے۔ اخلاقی اقدار آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہیں اور مادی مفادات ہی حیات و کائنات کی اصل حقیقت قرار پا رہے ہیں۔ یہی فیض ہے جو ہمارے نوجوانوں نے اِس نظامِ تعلیم سے حاصل کیا ہے۔ اب ہم کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارا یہ نظامِ تعلیم حقیقت میں:

ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

[۱۹۸۷ء]

تعلیمی نظام

ہماری قوم کا ایک بڑا مسئلہ اُس کے تعلیمی نظام کی آفات ہیں۔ اِن میں تین چیزیں بالخصوص قابل توجہ ہیں:

ایک یہ کہ ہماری تہذیبی روایت سے یہ نظام ہمارا رشتہ بتدریج منقطع کر رہا ہے۔ نئی نسلوں سے ملیے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ اگلے دس بیس سال میں قومی حیثیت سے ہم اپنی یادداشت شاید کھو چکے ہوں گے۔ اِس سے پہلے عربی زبان سے بے گانگی نے چودہ سو سال اور فارسی سے بے گانگی نے گذشتہ بارہ سو سال ہماری یادداشت سے محو کر دیے ہیں۔ اب یہی معاملہ اردو کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہماری تہذیبی روایت کے تین سو سال اِس زبان سے وابستہ ہیں۔ اِس سے ہمارا رشتہ کمزور ہوا تو کچھ بھی باقی نہ رہے گا۔ یہ صرف زبان ہے جو تہذیبی روایت کو قائم رکھتی اور پوری حفاظت کے ساتھ اُسے آگے منتقل کرتی رہتی ہے۔ اِس سے محرومی کوئی معمولی حادثہ نہیں ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہماری آیندہ نسلیں اپنے اساطین علم و ادب کو پڑھنا تو ایک طرف، اُن کے ناموں سے بھی غالباً واقف نہیں ہوں گی۔ یہ کتنا بڑا نقصان ہے؟ اِس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو قومی شخصیت کی تعمیر میں اُن عوامل کی اہمیت کو سمجھتے ہیں جو تہذیبی

روایت سے پیدا ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ بارہ سال کی عمومی تعلیم ہر شعبۂ زندگی میں اختصاصی تعلیم کے لیے بنیادی مہارت فراہم کرتی ہے، مگر دین کا عالم بننے کے لیے اِس طرح کی کوئی بنیاد فراہم نہیں کرتی۔ دینی مدارس اِس کوتاہی سے پیدا ہوئے ہیں اور جب تک یہ باقی رہے گی، اِسی طرح پیدا ہوتے رہیں گے۔ سوسائٹی کو جس طرح سائنس دانوں، ادیبوں، شاعروں، ڈاکٹروں اور انجینئروں کی ضرورت ہے، اِسی طرح دین کے جید علما کی بھی ضرورت ہے۔ اِس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اختصاصی تعلیم کی درس گاہیں قائم کی جائیں تو اُن میں داخلے کے لیے بنیادی اہلیت کہاں پیدا ہوگی؟ اِس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

تیسرے یہ کہ ہم کسی شخص کو یہ اجازت تو نہیں دیتے کہ بارہ سال کی عمومی تعلیم کے بغیر وہ بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر یا کسی دوسرے شعبے کا ماہر بنانے کے ادارے قائم کرے، مگر دین کا عالم بننے کے لیے اِس طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اِس مقصد کے لیے طلبہ ابتدا ہی سے ایسے مدرسوں میں داخل کر لیے جاتے ہیں، جہاں اُن کے مستقبل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ قدرت نے، ہوسکتا ہے کہ اُنھیں ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان یا شاعر و ادیب اور مصور بننے کے لیے پیدا کیا ہو، مگر یہ مدارس اُن کی اہلیت، صلاحیت اور ذوق و رجحان سے قطع نظر اُنھیں عالم بناتے اور شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد زندگی کے کسی دوسرے شعبے کا انتخاب کر لینے کے مواقع اُن کے لیے ختم کر دیتے ہیں۔ پھر جن کو عالم

بناتے ہیں، بارہ سال کی عمومی تعلیم سے محرومی کے باعث اُن کی شخصیت کو بھی ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں جس سے وہ اپنے ہی معاشرے میں اجنبی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہ صورت حال اپنی اصلاح کے لیے غیر معمولی اقدامات کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے ارباب حل وعقد اِس کی توفیق پائیں تو اِس کے لیے ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

۱۔ مذہبی اور غیر مذہبی اور اردو اور انگریزی ذریعۂ تعلیم کی ہر تفریق ختم کر دی جائے۔ تمام معاشرتی علوم اردو میں، سائنس اور ریاضی انگریزی زبان میں اور دینیات براہ راست عربی زبان میں پڑھائی جائے۔

۲۔ دینی تعلیم کے لیے پہلی پانچ جماعتوں میں صرف نماز کی دعائیں، حج کا تلبیہ اور ق (۵۱) سے الناس (۱۱۴) تک قرآن مجید کے آخری دو باب یاد کرائے جائیں۔ عربی زبان کی تعلیم چھٹی جماعت سے شروع کی جائے، زبان کے ضروری قواعد سکھانے کے بعد قرآن مجید کو ریڈر بنا دیا جائے جسے طلبہ بارھویں جماعت تک پورا ختم کر لیں۔ مطالعۂ پاکستان اور اسلامیات کا جو مضمون اِس وقت شامل نصاب ہے، اُسے ختم کر دیا جائے۔ اِس کی جگہ تاریخ پڑھائی جائے جس میں طلبہ دنیا کی تاریخ بھی پڑھیں اور اِس کے ساتھ پاکستان سمیت مسلمانوں کی پوری تاریخ کا مطالعہ بھی کر لیں۔

۳۔ فارسی اردو کے نہایت قریب ہے۔ اِس کے ضروری قواعد زیادہ سے زیادہ تین ماہ میں پڑھے جا سکتے ہیں۔ آٹھویں سال میں اِسے بھی اردو زبان کی تعلیم ہی کا

ایک حصہ بنا کر پڑھا دیا جائے۔

۴۔ سائنس اور آرٹس کے ساتھ نویں سال سے دینیات گروپ شروع کیا جائے جس میں عربی زبان و ادب، تاریخ، فلسفہ، عالمی ادبیات اور دین و شریعت کی مختلف تعبیرات کا مطالعہ اِن مضامین کے ابتدائی تعارف کی حد تک کرا دیا جائے۔ جو طلبہ دین کے عالم بننا چاہیں، اُنھیں موقع دیا جائے کہ وہ اِس گروپ کا انتخاب کریں اور اِس شعبے کی اختصاصی تعلیم کے اداروں میں داخلے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر لیں۔

۵۔ طب اور انجینئرنگ کی طرح دینی تعلیم کے اداروں کو بھی اختصاصی تعلیم کے اداروں کی حیثیت سے قومی تعلیمی نظام کا حصہ بنایا جائے۔ نیز پابند کیا جائے کہ بارہ سال کی عمومی تعلیم کے بغیر وہ کسی طالب علم کو اپنے اداروں میں داخل نہیں کریں گے۔ اِن میں سے جو ادارے اعلیٰ تعلیم کے لیے مسلمہ معیارات کے مطابق ہوں، اُن کی ڈگریاں اِن اصلاحات کے بعد بی اے، ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے تسلیم کر لی جائیں۔

ہماری مسجدیں

ہمارے معاشرے پر اثر انداز ہونے والے عوامل میں مسجدوں کی اہمیت غیر معمولی

ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سنت اِن کے بارے میں قائم کی، وہ یہ تھی کہ اِن میں نماز جمعہ کا خطاب اور اُس کی امامت امیر ریاست اور اُس کے عمال کریں گے۔ اُن کے علاوہ کوئی دوسرا شخص اگر کسی حجت شرعی کی بنا پر اُن کی معذوری کی صورت میں اِس مقصد کے لیے منبر پر کھڑا ہوگا تو اُن کی اجازت سے اور اُن کے قائم مقام کی حیثیت سے کھڑا ہوگا۔

یہ درحقیقت خدا کے آخری پیغمبر کی طرف سے اِس بات کا اعلان تھا کہ دین حق میں مسجد ہی ایوان اقتدار ہے۔ یہاں کوئی پوپ ہے نہ برہمن۔ مسلمان جسے اپنی سیاست کا امام بنائیں گے، اُن کی عبادت کا امام بھی وہی ہوگا۔ مذہب و سیاست کی ہر تفریق اب ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو خلافت آپ کے صحابہ نے قائم کی، اُس میں یہ سنت پوری شان کے ساتھ قائم رہی، لیکن بعد کے زمانوں میں جب حکمران اپنے اعمال کی وجہ سے لوگوں کے روبرو کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے تو مسجدوں کا منبر خود اُنھوں نے علما کے سپرد کر دیا۔ یہ ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ الم انگیز حادثہ ہے۔ اِس کے نتیجے میں، اب ہم دیکھتے ہیں کہ مذہب اپنے جلال اور سیاست اپنے جمال سے محروم ہو گئی ہے۔ وہ جنھیں سرفرازی حاصل ہونی چاہیے تھی، صدیوں سے سرنگوں ہیں اور جنھیں سرنگوں ہونا چاہیے تھا، اُنھوں نے اِس طرح سر اٹھائے ہیں کہ اُنھیں جھکانے کی کوشش کی جائے تو ہزاروں فتنے سر اٹھاتے ہیں۔ مسجدیں مختلف فرقوں کے حصار ہیں

جن میں بیٹھ کر اُن کے سرخیل ایک دوسرے پر سنگ باری کرتے ہیں۔ جمعہ کے منبر سے جو ریاست اُنھیں حاصل ہوئی ہے، اُس نے پیشہ ور مولویوں کا ایک ایسا گروہ ہمارے معاشرے میں پیدا کر دیا ہے جس کا وجود علما کے لیے باعث ننگ ہے۔ یہ جب کسی کی مخالفت میں زبان کھولتے ہیں تو اُس سے کژدم بکھرتے اور اژدر پھنکارتے ہیں۔ دعوت حق کا ہر علم بردار اِن کے تیروں سے چھلنی ہوتا ہے اور علم و تحقیق ہمیشہ اِن کے پتھروں کی زد میں رہتے ہیں۔ ہر مسجد کا دروازہ فرقہ دارانہ ضلالتوں کی تبلیغ کے لیے کھلا اور قرآن و سنت کی خالص دعوت کے لیے بند ہے۔ کسی صاحب علم کے لیے ممکن نہیں کہ وہ اللہ کے گھر میں بیٹھ کر تعلیم و دعوت کا وہ فرض ادا کر سکے جو اُس کے پروردگار کی طرف سے اُس پر عائد ہوتا ہے۔

ہماری مسجدوں کا یہ بگاڑ کسی صاحب نظر سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اِس کی اصلاح یقیناً اُس سنت کو زندہ کرنے ہی سے ہو سکتی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ ہمارے نزدیک، اِس کے لیے حسب ذیل اقدامات ضروری ہیں:

۱۔ ریاست میں ہر انتظامی وحدت کا مرکز اُس کی جامع مسجد کو قرار دیا جائے اور انتظامی وحدتوں کی تقسیم اِس طرح کی جائے کہ ہر وحدت کی جامع مسجد اُس کی پوری آبادی کے لیے کفایت کرے۔

۲۔ تمام وحدتوں کے لیے ضروری انتظامی دفاتر اور عدالتیں اِن جامع مسجدوں ہی سے ملحق قائم کی جائیں۔

۳۔ ریاست کے صدر مقام اور ہر صوبائی دارالحکومت میں ایک مسجد کو مرکزی جامع مسجد قرار دیا جائے۔

۴۔ نماز جمعہ کا خطاب اور اُس کی امامت ریاست کے صدر مقام کی مرکزی جامع مسجد میں سربراہ مملکت، صوبوں میں گورنر اور مختلف انتظامی وحدتوں کی جامع مسجدوں میں اُن کے عمال کریں۔

۵۔ اِن کے علاوہ تمام مساجد میں جمعہ کی اقامت ممنوع قرار دی جائے۔

۶۔ مساجد کا اہتمام حکومت خود کرے۔

۷۔ ہر صاحب علم کو حق حاصل ہو کہ وہ جس مسجد میں چاہے، اپنے نقطۂ نظر کے مطابق تعلیم و تدریس اور اصلاح و ارشاد کی مجالس منعقد کرے۔

[۱۹۸۷ء]